زیر سرپرستی

جاوید احمد غامدی

ریاست ہائے متحدہ امریکہ

ماہ نامہ

اشراق

جون 2024ء

مدیر: سید منظور الحسن

اشراق آڈیو

مدیر آڈیو: محمد حسن الیاس

www.ghamidi.org

غامدی سینٹر آف اسلامک لرننگ، المورد امریکہ

ریاست ہائے متحدہ امریکہ

اشراق

ماہ نامہ

جلد ۲ شمارہ ۶ جون ۲۰۲۴ء ذیقعدہ ۱۴۴۵ھ

زیر سرپرستی

جاوید احمد غامدی

مدیر

سید منظور الحسن

مدیر آڈیو اشراق: محمد حسن الیاس

مدیر انتظامی: فرحان سید

مجلس تحریر: ریحان احمد یوسفی، ڈاکٹر عمار خان ناصر، ڈاکٹر عرفان شہزاد، محمد ذکوان ندوی، نعیم بلوچ

معاون مدیر: شاہد محمود

فہرست

شذرات

الحاد کا مقدمہ — جاوید احمد غامدی — 3

سیاسی، سماجی اور مذہبی قائدین کا رویہ — سید منظور الحسن — 13

”عمار خان ناصر کو بات نہیں کرنے دیں گے“ — محمد حسن الیاس — 17

قرآنیات

البیان: البقرہ 2: 142-152 (10) — جاوید احمد غامدی — 20

معارف نبوی

احادیث — جاوید احمد غامدی / محمد حسن الیاس — 24

دین و دانش

قربانی — جاوید احمد غامدی — 26

www.ghamidi.org

غامدی سینٹر آف اسلامک لرننگ، المورد امریکہ

شق القمر: غامدی صاحب کا موقف (11)	سید منظور الحسن	28
نقد و نظر		
رفقاے "المورد" کے نام	محمد ذکوان ندوی	34
نقطۂ نظر		
برصغیر میں دیوبندی بریلوی مباحثات کا تاریخی پس منظر	ڈاکٹر عمار خان ناصر	48
اصلاح و دعوت		
صبر: دنیا اور آخرت میں کامیابی کا راستہ	ریحان احمد یوسفی	58
سیر و سوانح		
حیاتِ امین (10)	نعیم احمد بلوچ	70
ادبیات		
کونپل	جاوید احمد غامدی	77
حالات و وقائع		
پاکستان، امریکہ اور مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ (1)	محمد حسن الیاس / رانا معظم صفدر	79
خبر نامہ "المورد امریکہ"	شاہد محمود	84

جاوید احمد غامدی

الحاد کا مقدمہ

مذہب جس خدا پر ایمان کی دعوت دیتا ہے، اُس کے مقابل میں وہ لوگ ہمیشہ رہے ہیں جو ہماری اِس کائنات ہی کو انسان کا خالق سمجھتے ہیں۔ اِسے الحاد کہا جاتا ہے۔ سترھویں صدی سے پہلے مذہب اور مذہبی فکر کا سیاسی غلبہ عالمی سطح پر قائم تھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد کم و بیش ایک ہزار سال تک یہ غلبہ اِسی طرح قائم رہا۔ الہامی صحائف میں اِس کی مدت یہی بیان ہوئی ہے۔[1] یہ خدا کے فرستادوں کی پیشین گوئی تھی، لہٰذا حرف بہ حرف پوری ہوئی، اور اب یہ غلبہ پوری دنیا میں ختم ہو چکا ہے۔ اِس سے جو فضا پیدا ہوئی ہے، اُس میں الحاد کے علم بردار بڑی تعداد میں نمایاں ہو گئے ہیں اور مذہب کے خلاف اپنا مقدمہ پورے یقین و اذعان کے ساتھ پیش کر رہے ہیں۔ یہ مقدمہ جن اعتراضات کی صورت میں پیش کیا جا رہا ہے، وہ بنیادی طور پر چار ہی ہیں۔ اِن کا جواب قرآن نے جس طرح دیا ہے، ہم یہاں اُس کی وضاحت کریں گے:

پہلا اعتراض یہ ہے کہ خدا کا تصور انسان کے فکری ارتقا کا نتیجہ ہے۔ چنانچہ ہم دیکھ سکتے ہیں کہ قرآن جس خدا کا تعارف کراتا ہے، اُس کے کوئی آثار انسان کی ابتدائی تاریخ میں نہیں ملتے۔ اُس

---

[1] ۔ کلام مقدس، مکاشفہ 20: 9-7۔

کو جہاں سے دیکھیے، شرک کے مظاہر اُس میں ہر جگہ موجود ہیں، مگر توحید کسی جگہ نظر نہیں آتی۔ چنانچہ واقعہ یہی ہے کہ ایک خدا کا تصور اِس تاریخ میں بہ تدریج نمایاں ہوا ہے، اور وہ بھی اُس کے پیش کرنے والوں کے حالات کی رعایت سے کسی جگہ بادشاہ، کسی جگہ غیور شوہر اور کسی جگہ غریبوں کے ہم درد کسی مذہبی رہنما کی حیثیت سے۔ پھر یہی نہیں، مشرکانہ مذاہب کے مراسم عبودیت بھی وہ اِس سفر سے اپنے ساتھ لے کر آیا ہے، اور ہر زمانے میں اِنھی کو اپنے لیے خاص کرنے کا مطالبہ کرتا رہا ہے۔ اِس کے بعد کس طرح ممکن ہے کہ انسانوں کے بنائے ہوئے اِس خدا کو کوئی عاقل اپنا خالق و مالک اور معبود ماننے کے لیے تیار ہو جائے؟

اِس اعتراض کے جواب میں عرض ہے کہ ارتقا کا یہ افسانہ محض افسانہ ہی ہے۔ اِس کی کوئی بنیاد حقائق کی دنیا میں تلاش نہیں کی جا سکتی۔ انسان کے مذہبی فکر کی تاریخ سے متعلق جو معلومات اب تک حاصل ہوئی ہیں، اُن کی رو سے اِس کو زیادہ سے زیادہ پانچ ہزار سال تک پیچھے لے جا سکتے ہیں۔ لیکن زمین پر انسان کی عمر بھی کیا یہی ہے؟ اِس سے متعلق جو تحقیقات اب تک ہوئی ہیں، اُن کی روشنی میں اِس کا کم سے کم اندازہ بھی اگر لگایا جائے تو یہ اِس سے ہزاروں سال پہلے کا واقعہ ہے۔ اِس کے بعد کیا چیز ہے جو قرآن کے اِس بیان کو جھٹلا دے سکتی ہے کہ انسان ابتدا میں ایک ہی مذہب پر تھے۔ اِس کی ہدایت اُنھیں خود اُن کے پروردگار نے دی تھی۔ اُن کے مذہبی فکر میں انحرافات اِس کے بعد کسی زمانے میں داخل ہوئے، جس کے نتیجے میں اختلافات پیدا ہو گئے۔ شرک اِسی دور کی چیز ہے۔ چنانچہ یہ حقیقت ہے کہ مذہبی فکر کا سفر شرک سے توحید کی طرف نہیں، بلکہ توحید سے شرک کی طرف ہوا ہے۔ ارشاد فرمایا ہے:

وَمَا كَانَ النَّاسُ اِلَّا اُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ فِيْمَا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ.(یونس 19:10)

”حقیقت یہ ہے کہ لوگ ایک ہی امت تھے، اُنھوں نے بعد میں اختلاف کیا، اور اگر تیرے پروردگار کی طرف سے ایک بات[2] پہلے طے نہ کر لی گئی ہوتی تو اِن کے درمیان اُس چیز کا فیصلہ کر دیا جاتا، جس

[2]۔ یعنی یہ بات کہ اختلافات کا حتمی فیصلہ قیامت کے دن سنایا جائے گا۔

میں یہ اختلاف کر رہے ہیں۔‘‘

پچھلے دو ہزار سال کی تاریخ بھی اِسی حقیقت کی گواہی دیتی ہے۔ اہل علم جانتے ہیں کہ اِس تاریخ کی ابتدا خدا کے دو جلیل القدر پیغمبروں ـــــ مسیح اور محمد ـــــ کی طرف سے توحید کی منادی سے ہوئی تھی۔ مگر اِس کے بعد دیکھ لیجیے کہ فلسفہ اور تصوف کی آمیزش نے اُن کی تعلیمات میں کیا کیا انحرافات پیدا کر دیے ہیں، یہاں تک کہ خود مسیح علیہ السلام کے پیرو اُن کو خدا کا بیٹا اور اُن کی ماں کو مادر خدا بنا کر اُن سے دعا و مناجات کرتے نظر آتے ہیں، اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پیروؤں میں بھی ایسے لوگ پیدا ہو گئے ہیں، جو احمد کے پردے میں احد کو دیکھتے اور ذوق و مستی کے عالم میں پکار اٹھتے ہیں:

وہی جو مستوی عرش تھا خدا ہو کر
اتر پڑا ہے مدینے میں مصطفیٰ ہو کر

اِس کے بعد یہ حقیقت محتاج دلیل نہیں رہتی کہ مراسم عبودیت بھی اصلاً خدا کی طرف سے اور خدا ہی کے لیے مقرر کیے گئے تھے، مگر شرک نے جب اپنے معبود تخلیق کیے تو بعض ترامیم کے ساتھ اُنھی کو اپنے اُن معبودوں کے لیے بھی اختیار کر لیا۔ چنانچہ پیغمبروں کی بعثت ہوئی تو لوگوں سے جو سب سے بڑا مطالبہ اُن کی دعوت میں کیا گیا، وہ یہی تھا کہ لوگو، یہ مراسم عبودیت صرف خدا کے لیے خاص ہیں اور اُسی کے لیے خاص رہنے چاہییں، اِس لیے کہ تنہا وہی تمھارا پروردگار، وہی کائنات کا بادشاہ اور وہی معبود ہے، اُس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔

رہی یہ بات کہ الہامی صحائف میں خدا کا تصور بہ ظاہر متفاوت نظر آتا ہے تو اِس کی وجہ محض سوء فہم ہے۔ یہ صحائف ادب عالیہ کا بہترین نمونہ ہیں۔ لہٰذا ایک ایک مقام پر اِن کی آیات کو اِن کے مرتبین کے تاریخی بیانات سے الگ کر کے دکھایا جا سکتا ہے کہ لوگوں نے کس قلت علم، قلت تدبر اور کس بے ذوقی کے ساتھ اِن کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے، اور اِس طرح اِن کا سارا حسن اپنی تشریحات سے غارت کر دیا ہے۔ اِس کے بعد یہی کہا جا سکتا ہے کہ: شعر مرا بہ مدرسہ کہ برد۔

دوسرا اعتراض یہ ہے کہ مذہب کو لوگوں نے جس طرح سمجھا اور اُس کے نتیجے میں جو مذہبی

فکر وجود میں آیا ہے، وہ ایک مجموعۂ تضادات ہے۔ اُس میں نہ خدا کے تصور پر اتفاق ہے، نہ اُس کی صفات اور اُس کے افعال پر، نہ انسان کے ساتھ اُس کے معاملہ کرنے کے طریقے پر، نہ اُس کے احکام و ہدایات پر، نہ انسان سے اُس کے مطالبات پر، نہ انسان اور کائنات کے بارے میں اُس کے مزعومات پر، گویا وہی معاملہ ہے کہ: لائے ہیں بزم ناز سے یار خبر الگ الگ۔ اِس کے بعد کسی عاقل سے کیا یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ اِس مجموعۂ تضادات کو وہ کسی بھی درجے میں قابل التفات سمجھے گا یا اِس پر ایمان لائے گا؟

اِس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ وجودی حقائق کے ادراک اور اُن سے اخذ و استدلال کی جو صلاحیت انسان کو عطا ہوئی ہے، یہ اختلافات اُس کا لازمی نتیجہ ہیں۔ انسان نے جو کمالات اِس دنیا میں اب تک دکھائے ہیں، وہ سب اِسی صلاحیت کا فیضان ہے۔ اِس میں شبہ نہیں کہ اِس کے سوء استعمال سے مسائل پیدا ہوئے ہیں، لیکن غور کیجیے تو انسان کا اصلی شرف یہی صلاحیت ہے۔ انسان اِسی سے انسان ہے۔ اُس کے خالق نے اُس کو اِسی طرح بنایا ہے اور آگے بھی اِسی کے ساتھ حیات ابدی کی بشارت دی ہے۔ اِس کے بعد کس طرح توقع کی جا سکتی ہے کہ اپنی ہدایت کے فہم میں وحدت پیدا کرنے کے لیے وہ انسان سے یہ صلاحیت سلب کر لے گا؟ ہرگز نہیں، اُس نے صاف فیصلہ سنا دیا ہے کہ 'لَآ اِكۡرَاهَ فِى الدِّيۡنِ'،[3] دین کے معاملے میں کسی پر کوئی جبر نہیں کیا گیا اور نہ آیندہ کبھی کیا جائے گا۔

تاہم اِس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ انسان کو اِس کے نتیجے میں اختلافات کی بھول بھلیاں میں سرگرداں رہنے کے لیے چھوڑ دیا گیا ہے۔ قرآن نے بتایا ہے کہ خدا کا دین تو ایک ہی ہے اور اُس کا نام بھی ہمیشہ سے ''اسلام'' ہی رہا ہے، لیکن اُس کے سمجھنے میں یہ صورت حال جیسے ہی پیدا ہوئی تھی، خدا نے ہر قوم میں اپنے پیغمبر بھیجنا شروع کر دیے اور اُن کے ساتھ اپنی کتابیں بھی نازل کر دی تھیں۔ یہ کتابیں حق و باطل میں امتیاز کے لیے میزان اور فرقان کی حیثیت سے نازل کی گئیں تاکہ لوگ اِن کے ذریعے سے اپنے اختلافات کا فیصلہ کر سکیں اور اِس طرح حق کے معاملے میں ٹھیک انصاف پر

---

[3]۔ البقرہ 2:256۔

قائم ہو جائیں۔ ارشاد فرمایا ہے:

كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَّاحِدَةً فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَ مُنْذِرِيْنَ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ. (البقرہ2:213)

”لوگ ایک ہی امت تھے، پھر (اُن میں اختلاف پیدا ہوا تو) اللہ نے نبی بھیجے، بشارت دیتے اور انذار کرتے ہوئے اور اُن کے ساتھ قول فیصل کی صورت میں اپنی کتاب نازل کی تاکہ لوگوں کے درمیان وہ اُن کے اختلافات کا فیصلہ کر دے۔“

اِس سلسلہ کی آخری کتاب قرآن مجید ہے۔ دنیا کے الہامی لٹریچر میں اب تنہا یہی کتاب ہے، جس کے بارے میں یہ بات پورے یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ جس طرح دی گئی، بغیر کسی ادنیٰ تغیر کے بالکل اُسی طرح، اُسی زبان میں اور اُسی ترتیب کے ساتھ اِس وقت ہمارے پاس موجود ہے۔ اِس کا یہ تواتر خود ایک معجزہ ہے، اِس لیے کہ یہ دنیا کی واحد کتاب ہے، جس کو اِس وقت بھی لاکھوں مسلمان ’اَلْحَمْد‘ سے ’وَالنَّاس‘ تک محض حافظے کی مدد سے زبانی سنا سکتے ہیں۔ تاریخ بتاتی ہے کہ پچھلے چودہ سو سال میں اِس کی روایت کا یہ سلسلہ ایک دن کے لیے بھی منقطع نہیں ہوا۔ اِس سے صاف واضح ہے کہ اِس کی حفاظت کا یہ اہتمام خود پروردگار عالم کی طرف سے ہوا ہے۔ اِس کے جن پہلوؤں کی طرف خود قرآن نے جگہ جگہ توجہ دلائی ہے، وہ استاذ امام امین احسن اصلاحی کے الفاظ میں یہ ہیں:

”ایک یہ کہ قرآن کے زمانۂ نزول میں اللہ تعالیٰ نے اِس امر کا خاص اہتمام فرمایا کہ قرآن کی وحی میں شیاطین کوئی مداخلت نہ کر سکیں۔ یوں تو اِس نظام کائنات میں یہ مستقل اہتمام ہے کہ شیاطین ملاء اعلیٰ کی باتیں نہ سن سکیں، لیکن... نزول قرآن کے زمانے میں یہ اہتمام خاص طور پر تھا کہ شیاطین وحی الٰہی میں کوئی مداخلت نہ کر پائیں تاکہ اُن کو قرآن میں اس کے آگے سے (مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ)[4] کچھ گھسانے کا موقع نہ مل سکے۔

دوسرا یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اِس کام کے لیے اپنے جس فرشتے کو منتخب کیا، اُس کی صفت قرآن

---

[4]۔ حٰمٓ السجدہ 42:41۔

میں 'ذِیْ قُوَّۃٍ' مطاع، قوی، امین اور 'عِنْدَ ذِی الْعَرْشِ مَکِیْنٍ' وارد ہوئی ہے۔ یعنی وہ فرشتہ ایسا زور آور ہے کہ ارواح خبیثہ اُس کو مغلوب نہیں کر سکتیں، وہ تمام فرشتوں کا سردار ہے، وہ کوئی چیز بھول نہیں سکتا۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو امانت اُس کے حوالے کی جاتی ہے، وہ اُس کو بالکل ٹھیک ٹھیک ادا کرتا ہے۔ مجال نہیں ہے کہ اُس میں زیر زبر کا بھی فرق واقع ہو سکے۔ وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں بہت مقرب ہے، جو اِس بات کی دلیل ہے کہ وہ اپنی صلاحیتوں کے اعتبار سے تمام مخلوقات سے برتر ہے ـــــ ظاہر ہے کہ یہ اہتمام بھی اِسی لیے فرمایا گیا ہے کہ قرآن میں اُس کے منبع کی طرف سے کسی باطل کے گھسنے کا امکان باقی نہ رہے۔

تیسرا یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اِس امانت کو اٹھانے کے لیے جس بشر کو منتخب فرمایا، اول تو وہ ہر پہلو سے خود خیر الخلائق تھا، ثانیاً قرآن کو یاد رکھنے اور اُس کی حفاظت و ترتیب کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے تنہا اُس کے اوپر نہیں ڈالی، بلکہ یہ ذمہ داری اپنے اوپر لی۔ چنانچہ سورۂ قیامہ میں فرمایا ہے: 'لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ. اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ. فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ . ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ'[5] (اور تم اِس قرآن کو حاصل کرنے کے لیے اپنی زبان کو تیز نہ چلاؤ، ہمارے اوپر ہے اِس کے جمع کرنے اور اِس کے سنانے کی ذمے داری۔ تو جب ہم اِس کو سنا چکیں تو اِس سنانے کی پیروی کرو، پھر ہمارے ذمہ ہے اِس کی وضاحت)۔ روایات سے ثابت ہے کہ جتنا قرآن نازل ہو چکا ہوتا، اُس کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے مقرب صحابہ یاد بھی رکھتے اور ہر رمضان میں حضرت جبریل کے ساتھ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اُس کا مذاکرہ بھی فرماتے رہتے تاکہ کسی سہو و نسیان کا اندیشہ نہ رہے، اور یہ مذاکرہ اُس ترتیب کے مطابق ہوتا، جس ترتیب پر اللہ تعالیٰ نے قرآن کو مرتب کرنا پسند فرمایا۔ یہ بھی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حیات مبارک کے آخری رمضان میں یہ مذاکرہ دو مرتبہ فرمایا۔ پھر اِسی ترتیب اور اِسی قراءت کے مطابق پورا قرآن ضبط تحریر میں لایا گیا اور بعد میں خلفاے راشدین نے اِس کی نقلیں مملکت کے دوسرے شہروں میں بھجوائیں۔ یہ اہتمام پچھلے صحیفوں میں سے کسی کو بھی حاصل نہ ہو سکا۔ یہاں تک کہ تورات کے متعلق تو یہ علم بھی کسی کو

---

[5]۔ 75:16-19۔

نہیں ہے کہ اُس کے مختلف صحیفے کس زمانے میں اور کن لوگوں کے ہاتھوں مرتب ہوئے۔

چوتھا یہ کہ قرآن اپنی فصاحت الفاظ اور بلاغت معنی کے اعتبار سے معجزہ ہے، جس کے سبب سے کسی غیر کا کلام اُس کے ساتھ پیوند نہیں ہو سکتا۔ یہاں تک کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا کلام بھی، باوجود یکہ آپ اِس قرآن کے لانے والے اور افصح العرب والعجم ہیں، اُس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اِس وجہ سے اِس بات کا کوئی امکان نہیں ہے کہ کسی غیر کا کلام اُس کے ساتھ مخلوط ہو سکے۔ چنانچہ جن مدعیوں نے قرآن کا جواب پیش کرنے کی جسارت کی، اُن کے مزخرفات کے نمونے ادب اور تاریخ کی کتابوں میں موجود ہیں۔ آپ اُن کو قرآن کے مقابل میں رکھ کر موازنہ کر لیجیے، دونوں میں گہر اور پشیز کا فرق نظر آئے گا ـــــ اِس طرح گویا پیچھے سے بھی (وَلَا مِنْ خَلْفِہٖ)[6] قرآن میں دراندازی کی راہ مسدود کر دی گئی۔

پانچویں یہ کہ قرآن کی حفاظت کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے قرآن کی زبان کی حفاظت کا بھی قیامت تک کے لیے وعدہ فرمالیا۔ دوسرے آسمانی صحیفوں میں تو اُن کی اصل زبانیں مٹ جانے کے سبب سے بے شمار تحریفیں ترجموں کی راہ سے داخل ہو گئیں، جن کا سراغ اب ناممکن ہے، لیکن قرآن کی اصل زبان محفوظ ہے اور قیامت تک محفوظ رہے گی۔ اِس وجہ سے ترجموں اور تفسیروں کی راہ سے اُس میں کسی باطل کے گھسنے کا امکان نہیں ہے۔ اگر اُس میں کسی باطل کو گھسانے کی کوشش کی جائے گی تو اہل علم اصل پر پرکھ کر اُس کو چھانٹ کر الگ کر سکتے ہیں۔‘‘

(تدبر قرآن 7/ 112)

تیسرا اعتراض یہ ہے کہ مذہب جس خدا کو ماننے کی دعوت دیتا ہے، اُس کے رویے نہایت ظالمانہ ہیں۔ وہ بچوں تک کو بیماریوں اور تکلیفوں سے رلا رلا کر مار ڈالتا ہے، لاکھوں اور کروڑوں جانوروں کو روزانہ انسانوں سے ذبح کراتا اور دوسرے جانوروں سے پھڑواتا ہے، وہ کسی قاتل اور ظالم کا ہاتھ نہیں پکڑتا، بلکہ اُنھیں ظلم وعدوان کے مواقع فراہم کرتا ہے، بے شمار مخلوقات محض اِس لیے پیدا کرتا ہے کہ انسان اُنھیں سدھائیں اور اپنا محکوم بنائیں اور اُن کی ایک ایک چیز کو اپنے

---

[6]۔ حٰمٓ السجدہ 42:41۔

کام میں لائیں، یہاں تک کہ خود انسانوں کو انسانوں کے خلاف قتل و قتال کی ترغیب دیتا اور اُس پر اجر کے وعدے کرتا ہے۔ پھر یہی نہیں، اُس کی بنائی ہوئی یہ دنیا بھی ہر لحاظ سے کامل نہیں ہے۔ اِس میں زلزلے ہیں، بجلیاں ہیں، قحط ہیں، آلام ہیں، اور یہی نہیں، بعض جگہ نقائص بھی بتائے جاسکتے ہیں۔ اِس کے بعد کیسے مانا جائے کہ وہ کوئی رحمٰن و رحیم اور علیم و حکیم ہستی ہے، جس کا ذہن لامحدود اور قدرت بے پایاں ہے؟

اِس اعتراض کا جواب قرآن نے یہ دیا ہے کہ خدا کی صفات کمال اور صفات جلال و جمال کا ظہور جس دنیا میں اصلاً ہونا ہے، وہ ابھی پردۂ غیب میں ہے اور انسان کو اُسی دنیا کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ اِس وقت جو عظیم کائنات اور اُس کی اربوں کہکشانیں، بہ ظاہر بے آب و گیاہ اُس کے سامنے بکھری ہوئی ہیں، یہ سب اُسی دنیا کا سامان تعمیر ہے اور سامان تعمیر ہی کی طرح بے کراں خلا میں بکھیر دیا گیا ہے۔ قرآن نے فرمایا ہے کہ وہ دن اب زیادہ دور نہیں ہے، جب اِسے ایک دوسرے زمین و آسمان میں بدل دیا جائے گا اور سب اللہ واحد و قہار کے سامنے نکل کھڑے ہوں گے۔[7] اِس کے بعد ایک نئی دنیا وجود میں آئے گی، جس کی وسعت پوری کائنات کی وسعت ہو گی۔ وہ خدا کی دنیونت اور رحمت و عنایت کی دنیا ہے۔ ہم جس دنیا میں شعور کی آنکھ کھولتے ہیں، یہ اُسی کی تمہید ہے۔ اِسے نہ عدالت کے لیے برپا کیا گیا ہے اور نہ ظہور کمال کے لیے۔ اِس کا مقصد محض ابتلا ہے۔ یہاں تک کہ جن و انس سب عرصۂ امتحان میں ہیں۔ ارشاد فرمایا ہے:

الَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوۃَ لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا وَھُوَ الْعَزِیْزُ الْغَفُوْرُ. (الملک 67:2)

”وہی جس نے موت اور زندگی کو پیدا کیا تاکہ تم کو آزمائے کہ تم میں سے کون بہتر عمل کرنے والا ہے۔ اور وہ زبردست بھی ہے اور درگذر فرمانے والا بھی۔“

چنانچہ اِسی کا نتیجہ ہے کہ زندگی موت سے، خوشی غم سے، لذت الم سے، اطمینان اضطراب سے، راحت تکلیف سے اور نعمت اِس دنیا میں کبھی نقمت سے الگ نہیں ہوتی۔ اِنھیں زوجین کی

---

[7]۔ ابراہیم 14:48۔

طرح ایک دوسرے کے ساتھ لگا دیا گیا ہے۔ یہ ماضی کے پچھتاووں اور مستقبل کے اندیشوں کی دنیا ہے۔ انسان کو جو کچھ علم و دانش عطا ہوا ہے، وہ اِسی حقیقت کو سمجھنے کے لیے عطا ہوا ہے۔ قرآن کا ارشاد ہے کہ اصل حکمت یہی ہے اور جس نے اِسے پالیا، اُس نے درحقیقت خیر کثیر کا ایک خزانہ پالیا ہے۔[8] اِس لیے کہ اِسی سے انسان اپنے حدود علم کو پہچانتا اور خدا کو مسئول ٹھیرانے کے بجاے اُس کے سامنے اعتراف عجز کے ساتھ اُس کی اسکیم کو سمجھنے کی کوشش کرتا اور ہر لحظہ دست بہ دعا رہتا ہے کہ: 'رَبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا'[9]، پروردگار، میرا علم زیادہ کر دے۔ علم و فلسفہ کی سب سے بڑی محرومی اِسی حکمت سے محرومی ہے۔ خدا پر یہ اعتراض اِسی سے پیدا ہوتا اور انسان کو ہمیشہ کے لیے اُن ظلمتوں کے حوالے کر دیتا ہے، جن کے آگے پھر کوئی روشنی نہیں ہے۔

چوتھا اعتراض یہ ہے کہ انسان کے زمانۂ طفولیت میں، ہو سکتا ہے کہ اُس کو مذہب کی ضرورت رہی ہو، لیکن اب وہ عاقل و بالغ ہے، اُس نے تجربے، مشاہدے، استقرا اور استنباط پر مبنی اپنے علم اور اپنی سائنس کے ذریعے سے ہر مشکل کو حل کرنے کی کلید دریافت کر لی ہے۔ وہ اپنے گرد و پیش میں پھیلی ہوئی کائنات کو بھی بڑی حد تک سمجھنے لگا ہے، اور اُس نے معاشرے کی تنظیم اور سیاست و معیشت کی ضرورتوں کے لیے بھی نہایت اعلیٰ اقدار پر مبنی سماجی تشکیلات پیدا کر لیں اور ادارے بنا لیے ہیں، جن کو دیکھ کر اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ انسان کا اپنا علم اُن شرائع کے مقابل میں کتنا بلند و برتر ہے، جن کا قلادہ وہ مذہب کے نام پر صدیوں سے اپنی گردن میں ڈالے ہوئے تھا۔ اِس کے بعد کون ہے جو اِن شرائع کو کسی بھی درجے میں قبول کرنے کے لیے تیار ہو گا؟

اس اعتراض کے جواب میں عرض ہے کہ اِس طرح کا تقابل وہی لوگ کر سکتے ہیں، جو مذہب سے ناواقف محض ہوں۔ اِس لیے کہ مذہب کی ہدایت اِن میں سے کسی چیز کے لیے کبھی دی ہی نہیں گئی۔ وہ نہ اِس لیے نازل کیا گیا ہے کہ انسان کو سائنس کے قوانین سمجھائے، نہ اِس لیے کہ اُس کی طبی ضروریات پوری کرے اور نہ اِس لیے کہ معاشرے کی تنظیم اور سیاست و معیشت کی

---

[8]۔ البقرہ 2:269۔

[9]۔ طٰہٰ 20:114۔

ضرورتوں کے لیے اُس کو سماجی تشکیلات پیدا کرنا اور ادارے بنانا سکھائے۔ چنانچہ انسان نے جو کچھ اِس دنیا میں آکر کیا ہے، وہ انسان ہی کو کرنا تھا۔ اُس کے خالق نے اِس کے لیے اُسے غیر معمولی قوتیں اور صلاحیتیں دے کر پیدا کیا ہے۔ مذہب کا مقصد انسان کے علم و عمل اور اُس کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کا تزکیہ ہے۔ اُس کے مشمولات میں شریعت کی اصطلاح جن چیزوں کے لیے اختیار کی گئی ہے، وہ عبادات ہیں، تطہیر بدن کے احکام ہیں، تطہیر خورونوش اور تطہیر اخلاق کی ہدایات ہیں، اور یہ سب چیزیں بھی اصلاً اِس دنیا کے لیے نہیں، بلکہ آخرت کے لیے مطلوب ہیں۔ خدا کا فیصلہ ہے کہ اُس کا فردوس اُنھی لوگوں کے لیے ہے جو اپنا یہ تزکیہ کریں گے۔ اِس سے آگے مذہب کو کسی چیز سے کوئی دل چسپی نہیں ہے۔ لہٰذا خدا کی شریعت کو سمجھنا ہے تو اُس کے اِس مقصد اور اِس نصب العین کے لحاظ سے سمجھا جائے گا۔ اُس کی ضرورت کا فیصلہ بھی لازماً اِسی لحاظ سے ہو گا اور دنیا کے علوم و فنون میں اُس کا درجہ اور مرتبہ بھی اِسی رعایت سے متعین کیا جائے گا۔ چنانچہ دیکھیے، فرمایا ہے:

هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَكِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ.
(الجمعہ 2:62)

”اُسی نے امیوں کے اندر ایک رسول اُنھی میں سے اٹھایا ہے جو اُس کی آیتیں اُنھیں سناتا ہے اور اُن کا تزکیہ کرتا ہے، اور اِس کے لیے اُنھیں قانون اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اِس سے پہلے یہ لوگ کھلی گم راہی میں تھے۔“

افادات غامدی
سید منظور الحسن

سیاسی، سماجی اور مذہبی قائدین کا رویہ

[استاذِ گرامی کی ”المورد“ کے رفقا و احباب
سے کی گئی مختلف گفتگوؤں پر مبنی تحریر]

مذہبی اور سیاسی قائدین کو اپنے رفقا و معاونین کے ساتھ کیا رویہ اختیار کرنا چاہیے؟ یہ سوال ہر زمانے میں اہم رہا ہے، مگر موجودہ زمانے میں تنظیم سازی کے رجحان نے اِس کی اہمیت میں بہت اضافہ کیا ہے۔ ریاستی ادارے، سیاسی جماعتیں، مذہبی تنظیمیں، فلاحی انجمنیں اب اجتماعی نظم میں کام کرتی ہیں۔ اِس کے نتیجے میں قائدین اور معاونین و انصار کے دو اجزا وجود میں آتے ہیں جو باہم مل کر جدوجہد کرتے ہیں۔ قائدین لوگوں کو بلاتے ہیں اور لوگ اُن کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے اُن کے ساتھ کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ساتھ دینے کے اِس عمل کا محرک کوئی اعلیٰ آدرش، کوئی نیک مقصد ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ پورے اخلاص کے ساتھ اُن سے متعلق ہوتے اور دامے، درمے، سخنے، ہر طرح سے ایثار کا نذرانہ پیش کرتے ہیں۔ اِس تعلقِ خاطر اور ایثار و محبت کے نتیجے میں اُن کے اندر فطری طور پر یہ طلب پیدا ہوتی ہے کہ قائدین اُن کی طرف ملتفت ہوں، اُن کی حوصلہ افزائی کریں، اُن کی قدر پہچانیں اور اُن کے ساتھ شفقت و محبت سے پیش آئیں۔ یہ رویہ اگر نہ ملے تو وہ رنجیدہ اور بد دل ہو کر کنارہ کشی اختیار کر لیتے ہیں اور بعض صورتوں میں مخالفت اور

معاندت کی حد تک بھی پہنچ جاتے ہیں۔ یہ انسانوں کی عام عادت ہے۔ ہر زمانے، ہر علاقے اور ہر قوم کے لوگ اِسی پر عمل پیرا ہیں۔ اِس معاملے میں اُن میں کوئی فرق نہیں ہے۔

اِس امر واقعی کا تقاضا ہے کہ قائدین اپنے اندر خوے دل نوازی کو پیدا کریں۔ وہ اگر مخاطبین کو متعلق رکھنا چاہتے اور اُنھیں اپنا ہم نوا اور دست و بازو بنانا چاہتے ہیں تو اِس سے مفر نہیں ہے۔ پھر اُنھیں اپنے اندر مہربانی اور کرم گستری کی خُو پیدا کرنی ہو گی۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اُن کے ساتھ نرمی اور محبت سے بات کریں، ہر معاملے میں خوش خُلقی سے پیش آئیں، اُن کے مشورے کو توجہ سے سنیں، اُن کا حوصلہ بڑھائیں، اُن کی غلطیوں سے صرف نظر کریں، اُن کے جذبات کی قدر کریں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اُن کی عزت نفس کا خیال رکھیں۔ یہی رویہ ہے جو ہر قافلہ سالار اور ہر میر کارواں کے لیے زادِ راہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ شاعر مشرق نے بالکل درست کہا ہے:

نگہ بلند، سخن دل نواز، جاں پر سوز
یہی ہے رختِ سفر میر کارواں کے لیے

قرآنِ مجید نے اِس بات کو آخری درجے میں واضح کر دیا ہے۔ اُس نے رہبر کامل حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے طرزِ عمل اور اسوۂ حسنہ کو ایک قطعی اصول کے طور پر پیش کیا ہے اور بتایا ہے کہ قیادت سے پروردگار کا مطلوب رویہ وہی ہے جس کا بہترین نمونہ اُس کے رسول نے پیش کیا ہے۔ ارشاد فرمایا ہے:

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ۖ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ.
(آل عمران 3:159)

”سو یہ اللہ کی عنایت ہے کہ تم اِن کے لیے بڑے نرم خو واقع ہوئے ہو، (اے پیغمبر)۔ اگر تم درشت خو اور سخت دل ہوتے تو یہ سب تمھارے پاس سے منتشر ہو جاتے۔ اِس لیے اِن سے درگذر کرو، اِن کے لیے مغفرت چاہو اور معاملات میں اِن سے مشورہ لیتے رہو۔“

یہ پروردگارِ عالم کا خراجِ تحسین ہے اور اُس ہستی کے لیے ہے جو اللہ کا پیغمبر ہے، جس پر نبوت ختم ہوئی ہے اور جو اِس زمین پر قیامت تک کے لیے دین کا تنہا ماخذ ہے، جو ’اَلنَّبِيُّ اَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِيْنَ

مِنۡ اَنۡفُسِهِمۡ'[1] کے مقام پر فائز ہے—— یعنی اُس کا حق مسلمانوں پر خود ان کی اپنی ذات سے بھی مقدم ہے—— جس کی اطاعت اللہ کی اطاعت اور جس کی نافرمانی اللہ کی نافرمانی ہے، جو سلاطین کا سلطان، امیروں کا امیر اور بادشاہوں کا بادشاہ ہے، جس کے آگے گردنیں جھکتی، سرنگوں ہوتے اور دل فرشِ راہ ہوتے ہیں۔ اِس عظیم المرتبت ہستی کے بارے میں فرمایا ہے کہ اگر آپ نرم خو اور رحم دل نہ ہوتے تو یہ سب لوگ آپ سے منتشر ہو جاتے۔ گویا پوری طرح واضح کر دیا کہ نرم خوئی اور دل نوازی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جیسی واجب الاطاعت ہستی کے لیے بھی ضروری ہے۔ چنانچہ تاریخ شاہد ہے کہ اللہ نے اِس کا نہایت وافر بہرہ آپ کو عطا فرمایا تھا اور آپ نے اُس کی توفیق سے اِسے اِس سطح پر پہنچا دیا تھا کہ دنیا پکار اٹھی:

سلام اُس پر کہ اسرارِ محبت جس نے سکھلائے
سلام اُس پر کہ جس نے زخم کھا کر پھول برسائے
سلام اُس پر کہ جس نے خوں کے پیاسوں کو قبائیں دیں
سلام اُس پر کہ جس نے گالیاں کھا کر دعائیں دیں

واضح ہوا کہ قیادت کے لیے ناگزیر وصف خوے دل نوازی ہے۔ یہی اللہ کا مطلوب رویہ ہے اور یہی اُس کے رسول کا سلوک ہے۔ یہ وصف اگر کسی رہنما میں نہیں ہے تو وہ ہزار اوصاف رکھنے کے باوجود لوگوں کو ساتھ لے کر نہیں چل سکتا۔ رہنماؤں کو سمجھنا چاہیے کہ جب لوگ اُن کے ساتھ چل رہے ہوتے ہیں تو اُنھیں داروغہ اور کوتوال سمجھ کر نہیں چل رہے ہوتے۔ یہ اخوت و محبت کا رشتہ ہے، جس میں وہ بندھے ہوتے ہیں۔ اُن لوگوں کا خیال بہت غلط ہے جو یہ سمجھتے ہیں کہ سخت تنقید کرنے سے، بار بار غلطی کا احساس دلانے سے، عیب چینی سے، طنز و تعریض سے، درشت خوئی سے، سخت مزاجی سے اور محاسبے اور مواخذے سے اچھا نظم وجود میں آتا ہے۔ یہ سراسر خام خیالی ہے۔ اِس طریقے سے اچھا نظم تو کیا وجود میں آئے گا، خود نظم کا وجود ہی خطرے میں پڑ سکتا ہے۔ ایسے لوگ اگر قیادت کے منصب پر فائز ہو جائیں تو وہ اداروں، تنظیموں اور جماعتوں کو چلانے کے بجاے اُنھیں برباد کر دیتے ہیں۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ جو لوگ رضاکارانہ

---

[1]۔ الاحزاب 6:33۔

آئے ہوتے ہیں یا کسی بڑے مقصد کے لیے شریک عمل ہوتے ہیں، وہ ناقدری، بدلحاظی، دھونس، ملامت، درشتی کو قبول نہیں کرتے۔ اُنھیں دل گرفتہ اور آب دیدہ کر کے ساتھ کھڑا نہیں کیا جا سکتا۔ اُنھیں ساتھ لے کر چلنے کا واحد طریقہ لطف و کرم ہے۔ قیادت کو اُن کی محبت کی قدر کرنی چاہیے۔ اُس کا جواب زیادہ محبت سے دینا چاہیے۔ وہ اگر دس قدم ساتھ چلتے ہیں تو اُن کی شکر گزار ہو اور اگر دو قدم ساتھ دیتے ہیں تب بھی اُن کا شکریہ ادا کرے۔ جو جتنا تعاون کرے، اُسے خندہ پیشانی سے قبول کرے، زیادہ کا مطالبہ کر کے اُنھیں مشکل میں گرفتار نہ کرے۔ اُن سے کوئی غلطی ہوئی ہے تو شفیق استاد اور خیر خواہ دوست کی طرح اُنھیں توجہ دلائے۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ قیادت کے لیے ناگزیر ہے کہ وہ خوے دل نوازی سے متصف ہو۔ اگر اتفاقاً کوئی ایسا شخص قیادت کے منصب پر فائز ہو جائے جو اِس وصف کا حامل نہیں ہے تو اُسے اِس کو پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ کامیاب ہو جائے تو منصب سے وابستہ رہے، ورنہ اُسے کسی شیریں سخن، کسی گداز قلب، کسی محبت شعار کے لیے چھوڑ دے۔ وہ اگر ایسا نہیں کرتا تو سمجھ لینا چاہیے کہ پھر معاملہ وہی ہو گا کہ:

کوئی کارواں سے ٹوٹا، کوئی بدگماں حرم سے
کہ امیر کارواں میں نہیں خوے دل نوازی

محمد حسن الیاس

”عمار خان ناصر کو بات نہیں کرنے دیں گے“

نفسیات کا علم انسانی رویوں کے مطالعے کا نام ہے۔ ماہرین نفسیات سمجھتے ہیں کہ تعلیم، خاندان، معاش اور سماجی حالات وہ عوامل ہیں، جن کا اثر انسانوں کے انداز و اطوار اور فکر و عمل میں ظاہر ہوتا ہے۔

ہمارے مذہبی علما کے مجموعی طرزِ عمل کا جائزہ لیا جائے تو دو چیزیں بہت نمایاں نظر آتی ہیں: ایک چیز، اپنی بات منوانے کے لیے تحکم کا رویہ ہے اور دوسری چیز، لوگوں کے بارے میں حکم لگانے اور فیصلہ صادر کرنے کا جذبہ ہے۔

تاریخی تعامل میں اس کا سبب غالباً یہ ہے کہ خلیفہ منصور کے عہد میں جب علما کو عدلیہ اور قانون سازی کے مناصب پر فائز کیا گیا تو وہ بالواسطہ طور پر ریاستی اقتدار میں شریک ہو گئے۔ اِسی سے اُن کے اندر لوگوں کے فکر و عمل پر اپنا تسلط قائم کرنے کا رویہ پیدا ہوا۔ چنانچہ وہ اپنی ہر رائے کو حتمی، ہر قول کو فیصل اور ہر فیصلے کو حرف آخر سمجھنے لگے۔ اگر کوئی ان کے نقطۂ نظر سے اختلاف کرتا تو اُس کی حیثیت باغی، گم راہ اور منحرف کی ہوتی۔ اُس کی بات کو دبانا، اُسے لوگوں میں ڈس کریڈٹ (discredit) کرنا اور اسے نمونۂ عبرت بنانا حق کی حمایت اور دینی حمیت کا لازمی تقاضا قرار دیا جاتا۔

یہ وہ فکر و عمل ہے، جو کم و بیش ایک ہزار سال میں طاقت کے تہذیبی پس منظر سے پیدا ہو کر علما کی نفسیات کا جزو لاینفک بن چکا ہے۔

لیکن زمانہ بڑا صراف ہے، ستم یہ ہوا کہ جس ماحول نے انھیں یہ رویہ اپنانے کی مہمیز فراہم کی تھی، وہ عثمانیوں اور مغلوں کے خاتمے کے ساتھ یک دم ختم ہو گیا۔ دنیا میں عالمی طاقتوں کی حکمرانی کا دور شروع ہوا۔ اس کے بعد اب جناب شیخ نہ قاضی القضاۃ رہے، نہ دربار عالی کے مشیر خاص۔ زندگی کی تلخیاں ان کی منتظر تھیں۔ ان حقائق کے ساتھ جی کر علما کے پاس یہ موقع تھا کہ وہ غور کرتے کہ دین نے ان پر کیا ذمہ داری عائد کی ہے اور ان کا مقام ایک ناصح سے بڑھ کر کچھ نہیں۔ وہ داعی ہیں، قاضی نہیں ہیں۔ لیکن خوے بادشاہی کہاں جاتی ہے۔ انھوں نے ہوا کے مخالف چلنے کا فیصلہ کیا اور اپنی عظمت رفتہ کی یافت میں بقیہ دن گزارنے کا عزم کر لیا۔ اور وہ مقام جو ان سے چھن گیا تھا، اس کی یاد تازہ رکھ کر اپنی نفسیاتی تسکین کرنے لگے۔

آخر الامر اب ان کے ہاتھ میں تین ہتھیار بچے تھے، جو اُن کے مقام گم گشتہ کو بحال کر سکتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے ان تینوں ہتھیاروں کو استعمال کرنے کا فیصلہ کیا۔

ان میں سے پہلا ہتھیار ''تکفیر'' کا حق ہے۔

ہمارے علما یہ سمجھتے ہیں کہ لوگوں کے کفر و ایمان کا فیصلہ کر کے انھیں معاشرے میں اجنبی کر دینے کی یہ صلاحیت اور کسی کے پاس نہیں۔ یہ ان کی طاقت کا مظہر ہے۔ نظم ریاست میں وہ بھلے شریک نہ ہوں، لیکن اس کے باوجود ریاست کے سربراہ تک کے ایمان کو چیلنج کر سکتے ہیں۔ لہٰذا ان کی یہ حیثیت مان کر ان سے معاملہ کیا جانا چاہیے!

دوسرا ہتھیار حلت و حرمت کی اتھارٹی (authority) کا ہے۔

کھانے پینے کی چیزوں سے لے کر پہننے لگانے کی اشیا تک کے حرام و حلال کا فیصلہ ان کے قلم سے ہو گا۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اگرچہ وہ عدالتوں میں بیٹھ کر یہ فیصلے کرنے کا امکان کھو چکے ہیں، لیکن لوگ اب بھی خود کو مجبور محض سمجھ کر ان کے مدارس کی سلطنتوں میں مودب حاضر ہوں اور ان کی تصویب سے اپنے آلو اور پرفیوم حلال کرائیں، اور اپنے عقیدہ اور ایمان کی سند لیں۔

تیسرا ہتھیار لوگوں کے تقویٰ کی پیمایش ہے، ان کی دینی حیثیت کی تعیین اور ان کے راسخ العقیدہ ہونے اور ان کے مذہبی تشخص کا تعین ہے۔

علما یہ سمجھتے ہیں کہ وہ لوگوں کے دینی فہم اور ان کے عقیدہ و ایمان کو چیلنج کر کے یہ باور کرا سکتے ہیں کہ یہ نہایت کم زور مسلمان ہیں، لہٰذا ان کی صحیح بات بھی بے وزن ہے۔ وہ نماز میں صحیح

ہاتھ باندھنے کی تفتیش ہو یا قرآن کی تلاوت میں غنہ اور سکتے کی غلطی نکالنے کی کوشش، ڈاڑھی ناپنا ہو، گستاخی کا کوئی الزام لگانا ہو یا پھر مغربی فکر سے مرعوب ہونے کا طعنہ دینا ہو، یہ وہ ہتھیار ہیں، جو ان کی ہیبت کو پورے معاشرے پر قائم رکھے ہوئے ہیں۔

گذشتہ دنوں سپریم کورٹ میں ایک احمدی ملزم کے مقدمے میں جب انفرادی طور پر اظہار رائے کا موقع آیا تو چیف جسٹس نے انفرادی رائے پیش کرنے والوں کا موقف سننے کی بات کی اور فہرست میں درج عمار خان ناصر صاحب کا نام پکار کر پوچھا کہ کیا وہ موجود ہیں؟ عمار صاحب کمرۂ عدالت میں موجود تھے، مگر اِس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتے، حاضرین میں سے متعدد علما اکٹھے ہو گئے اور عدالت سے یہ مطالبہ کرنے لگے کہ کسی شخص کو انفرادی طور پر ہرگز نہ سنا جائے، صرف اداروں کے نمایندوں کو بولنے کا موقع دیا جائے۔ اس پر کافی بحث و تکرار ہوئی۔ چیف جسٹس کہتے رہے کہ آج ہم سب کو سننا چاہ رہے ہیں، لیکن مذہبی نمایندوں اور بعض وکلا کا موقف یہ تھا کہ اس سے فیصلہ متنازع ہو جائے گا۔ بالآخر چیف جسٹس نے پوچھا کہ کیا پھر آپ حضرات اس سے متفق ہیں کہ ہم کسی بھی انفرادی رائے کو یہ موقع نہ دیں؟ علما نے اثبات میں جواب دیا اور کہا کہ باقی افراد کو بھی نہ سنا جائے، لیکن عمار ناصر کو بالکل یہ موقع نہ دیا جائے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

یہ روداد سن کر مجھے اس طبقے پر بہت ترس آیا کہ انسان اپنی متاع گم گشتہ کی یافت میں جیے تو کیا بن جاتا ہے۔ وہ دلیل کے سامنے آنے سے خوف کھاتا ہے۔ کیونکہ اس کے نظام فکر میں اس کی کوئی حیثیت نہیں۔ ساتھ ہی اس بات پر بھی شرح صدر ہو گیا کہ مسائل احمدیت، توہین مذہب اور رسالت سے اوپر اٹھ کر بقا کی جنگ بن چکے ہیں۔

علما کو یہ شدید احساس ہے کہ اگر انھوں نے اپنا وجود باقی رکھنا ہے تو یہ تین ہتھیار ہیں۔ انھیں ہاتھ سے جانے نہیں دینا۔ یہ گئے تو وہ گئے۔

ہمارے اس تجزیے پر اگر کسی کو کوئی سوال ہو تو وہ مغرب میں جا کر اہل ”کلیسا“ سے پوچھ لے۔ معلوم ہو جائے گا کہ انھوں نے بھی اپنے زوال کی منزل کو انھی مراحل سے گزر کر حاصل کیا ہے۔

البیان

جاوید احمد غامدی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورۃ البقرۃ

(10)

سَيَقُوْلُ السُّفَهَآءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلّٰىهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِيْ كَانُوْا عَلَيْهَا ۭ قُلْ لِّلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَ الْمَغْرِبُ ۭ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَاۗءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۱۴۲﴾ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَاۗءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ۭ وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِيْ كُنْتَ عَلَيْهَآ اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ يَّنْقَلِبُ عَلٰي عَقِبَيْهِ ۭ وَاِنْ كَانَتْ لَكَبِيْرَةً اِلَّا عَلَي الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ ۭ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۴۳﴾

(ابراہیم کی بنائی ہوئی مسجد کو، اے پیغمبر، ہم نے تمھارے لیے قبلہ ٹھیرانے کا فیصلہ کیا ہے تو) اب اِن لوگوں میں سے جو احمق ہیں، وہ کہیں گے: اِنھیں کس چیز نے اِن کے اُس قبلے سے پھیر دیا جس پر یہ پہلے تھے؟ اِن سے کہہ دو: مشرق اور مغرب، سب اللہ ہی کے ہیں، وہ جس کو چاہتا ہے، (اِن تعصبات سے نکال کر) سیدھی راہ دکھا دیتا ہے۔ (ہم نے یہی کیا ہے) اور (جس طرح مسجد حرام کو تمھارا قبلہ ٹھیرایا ہے)، اُسی طرح ہم نے تمھیں بھی ایک درمیان کی جماعت بنا دیا ہے تاکہ

قَدْ نَرٰی تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِی السَّمَآءِ ۚ فَلَنُوَلِّیَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰىهَا ۪ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَحَیْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ ؕ وَاِنَّ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَیَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا یَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۴﴾ وَلَىِٕنْ اَتَیْتَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ بِكُلِّ اٰیَةٍ مَّا تَبِعُوْا قِبْلَتَكَ ۚ وَمَاۤ اَنْتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُمْ ۚ وَمَا بَعْضُهُمْ بِتَابِعٍ قِبْلَةَ بَعْضٍ ؕ وَلَىِٕنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ اِنَّكَ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِیْنَ ﴿۱۴۵﴾ اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْكِتٰبَ یَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا یَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ ؕ وَاِنَّ فَرِیْقًا مِّنْهُمْ لَیَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَهُمْ یَعْلَمُوْنَ ﴿۱۴۶﴾ اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِیْنَ ﴿۱۴۷﴾

وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّیْهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَیْرٰتِ ؕ اَیْنَ مَا تَكُوْنُوْا یَاْتِ بِكُمُ اللّٰهُ جَمِیْعًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿۱۴۸﴾

تم دنیا کے سب لوگوں پر (حق کی) شہادت دینے والے بنو اور اللہ کا رسول تم پر یہ شہادت دے۔ اور اِس سے پہلے، (اے پیغمبر)، جس قبلے پر تم تھے، اُسے تو ہم نے صرف یہ دیکھنے کے لیے ٹھیرایا تھا کہ کون رسول کی پیروی کرتا ہے اور کون الٹے پاؤں پھر جاتا ہے۔ اِس میں شبہ نہیں کہ یہ ایک بھاری بات تھی، مگر اُن کے لیے نہیں، جنھیں اللہ ہدایت سے بہرہ یاب کرے۔ اور اللہ ایسا نہیں ہے کہ (اِس طرح کی آزمایش سے وہ) تم لوگوں کے ایمان کو ضائع کرنا چاہے۔ اللہ تو لوگوں کے لیے بڑا مہربان ہے، سراسر رحمت ہے۔ 143-142

تمھارے منہ کا بار بار آسمان کی طرف اٹھنا ہم دیکھتے رہے ہیں، (اے پیغمبر)، سو ہم نے فیصلہ کر لیا کہ تمھیں اُس قبلے کی طرف پھیر دیں جو تم کو پسند ہے۔ لہٰذا اب اپنا رخ مسجد حرام کی طرف پھیر دو اور تم لوگ جہاں کہیں بھی ہو، (نماز میں) اپنے رخ اُسی کی طرف کرو۔ یہ لوگ جنھیں کتاب دی گئی تھی، جانتے ہیں کہ اُن کے پروردگار کی طرف سے یہی حق ہے، (لیکن اِس کے باوجود انکار کر رہے ہیں)، اور جو کچھ یہ کر رہے ہیں، اللہ اُس سے بے خبر نہیں ہے۔ اور اِن اہل کتاب کے سامنے، (اے پیغمبر)، تم اگر ہر طرح کی نشانیاں بھی پیش کر دو تو یہ تمھارے قبلے کی پیروی نہ کریں گے۔ اور (اِس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ جو علم تمھارے پاس آ چکا ہے، اِس کی بنا پر) تم بھی اِن کا قبلہ نہیں مان سکتے اور (اِن کی یہ ضد صرف تمھارے ساتھ نہیں ہے، حقیقت یہ ہے کہ) اِن میں سے کوئی گروہ بھی دوسرے کا قبلہ ماننے کے لیے تیار نہیں ہے۔ (لہٰذا اِن کو کوئی چیز

وَ مِنۡ حَیۡثُ خَرَجۡتَ فَوَلِّ وَجۡهَكَ شَطۡرَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ ؕ وَ اِنَّهٗ لَلۡحَقُّ مِنۡ رَّبِّكَ ؕ وَ مَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۴۹﴾

وَ مِنۡ حَیۡثُ خَرَجۡتَ فَوَلِّ وَجۡهَكَ شَطۡرَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ ؕ وَ حَیۡثُ مَا كُنۡتُمۡ فَوَلُّوۡا وُجُوۡهَكُمۡ شَطۡرَهٗ ۙ لِئَلَّا یَكُوۡنَ لِلنَّاسِ عَلَیۡكُمۡ حُجَّةٌ ۬ۙ اِلَّا الَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡا مِنۡهُمۡ فَلَا تَخۡشَوۡهُمۡ وَ اخۡشَوۡنِیۡ ۟ وَ لِاُتِمَّ نِعۡمَتِیۡ عَلَیۡكُمۡ وَ لَعَلَّكُمۡ تَهۡتَدُوۡنَ ﴿۱۵۰﴾ۙ كَمَاۤ اَرۡسَلۡنَا فِیۡكُمۡ رَسُوۡلًا مِّنۡكُمۡ یَتۡلُوۡا عَلَیۡكُمۡ اٰیٰتِنَا وَ یُزَكِّیۡكُمۡ وَ یُعَلِّمُكُمُ الۡكِتٰبَ وَ الۡحِكۡمَةَ وَ یُعَلِّمُكُمۡ مَّا لَمۡ تَكُوۡنُوۡا تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۱۵۱﴾ فَاذۡكُرُوۡنِیۡۤ اَذۡكُرۡكُمۡ وَ اشۡكُرُوۡا لِیۡ وَ لَا تَكۡفُرُوۡنِ ﴿۱۵۲﴾

اگر مطمئن کر سکتی ہے تو یہی کہ تم اِن کا قبلہ مان لو)، لیکن اُس علم کے بعد جو تمھارے پاس آ چکا ہے، تم اگر اِن کی خواہشوں کے پیچھے چلتے ہو تو تم بھی یقیناً اِنھی ظالموں میں سے ہو جاؤ گے۔ (یہ حقیقت ہے کہ) جن کو ہم نے کتاب دی ہے، وہ اِس چیز کو ایسا پہچانتے ہیں، جیسا اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں۔ اور اِن میں یہ ایک گروہ ہے جو جانتے بوجھتے حق کو چھپاتا ہے۔ (تم پر واضح ہو کہ) تمھارے پروردگار کی طرف سے یہی حق ہے، لہٰذا (اِس کے متعلق) تم کو ہرگز کسی شک میں نہ پڑنا چاہیے۔147-144

اور اِن میں سے ہر ایک نے (اپنے لیے قبلے کی) ایک سمت مقرر کر رکھی ہے، وہ اُسی کا رخ کرتا ہے۔ اِس لیے (تم لوگ اِنھیں چھوڑو اور) نیکیوں کی راہ میں آگے بڑھنے کی کوشش کرو۔ تم جہاں بھی ہو گے، اللہ تم سب کو (فیصلے کے لیے) اکٹھا کرے گا۔ اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔148

(اِنھیں چھوڑو، اے پیغمبر)، اور (سفر میں بھی ہمیشہ) جہاں سے نکلو، (نماز کے لیے) اپنا رخ مسجد حرام ہی کی طرف کرو۔ اِس میں شبہ نہیں کہ تمھارے پروردگار کی طرف سے یہی حق ہے، اور (یاد رکھو کہ) جو کچھ تم لوگ کرتے ہو، اللہ اُس سے بے خبر نہیں ہے۔149

اور (ایک مرتبہ پھر سنو کہ سفر میں بھی ہمیشہ) جہاں سے نکلو، (نماز کے لیے) اپنا رخ مسجد حرام ہی کی طرف کرو، اور (عام حالات میں بھی) تم لوگ جہاں کہیں ہو، اپنے رخ اِسی (مسجد) کی طرف کرو، اِس لیے کہ اِن لوگوں کو تمھارے خلاف کوئی حجت نہ ملے ـــــ ہاں اِن میں سے جو ظالم ہیں، اُن کی زبان تو کوئی چیز بھی بند نہیں کر سکتی، سو تم اُن سے نہ ڈرو، بلکہ مجھ سے ڈرو ـــــ اور اِس لیے کہ میں تم پر اپنی نعمت پوری کر دوں، اور اِس لیے کہ تم صحیح راستہ پا لو۔ چنانچہ

(یہی مقاصد ہیں جن کے لیے) ہم نے ایک رسول تم میں سے تمھارے اندر بھیجا ہے جو ہماری آیتیں تمھیں سناتا ہے اور تمھارا تزکیہ کرتا ہے اور اِس کے لیے تمھیں قانون اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے اور اِس طرح وہ چیزیں تمھیں سکھاتا ہے جو تم نہیں جانتے تھے۔ لہٰذا تم مجھے یاد رکھو، میں تمھیں یاد رکھوں گا اور میرے شکر گزار بن کر رہو، میری ناشکری نہ کرو۔ 152-150

[باقی]

ترجمہ و تحقیق: جاوید احمد غامدی / محمد حسن الیاس

— 1 —

حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے (اپنے صحابہ سے) فرمایا: دجال کے فتنے سے اللہ کی پناہ مانگو۔ صحابہ نے کہا: ہم دجال کے فتنے سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں۔ (مصنف ابن ابی شیبہ، رقم 29121)

—2 —

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: آگاہ رہو، میں تمھیں دجال کے بارے میں ایک ایسی بات بتاتا ہوں جو کسی نبی نے اپنی قوم کو نہیں بتائی۔ وہ یقیناً ایک آنکھ سے اندھا ہے اور اپنے ساتھ جنت اور دوزخ کی طرح کے مقامات لیے ہوئے آئے گا۔ سو جس کے بارے میں وہ کہے گا کہ باغ ہے، وہ درحقیقت آگ ہو گی۔ میں نے تمھیں اِس سے اُسی طرح خبردار کر دیا ہے، جس طرح نوح (علیہ السلام) نے اِس کے بارے میں اپنی قوم کو خبردار کیا تھا۔ (صحیح مسلم، رقم 2936)

—3 —

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کوئی نبی مبعوث نہیں ہوا، مگر یہ کہ اُس نے اپنی امت کو جھوٹے اور یک چشم دجال سے ضرور خبردار کیا ہے۔ چنانچہ تم بھی اُس سے پوری طرح خبردار رہو۔ جان رکھو کہ وہ بائیں آنکھ سے اندھا ہے، اُس

پر ایک موٹی جھلی ہے۔ اور تمھارا پروردگار جس کی ہستی بڑی بابرکت اور بلند و برتر ہے، یک چشم نہیں ہے۔ دجال کی دونوں آنکھوں کے مابین 'کافر' لکھا ہوا ہے۔ جو نبی بھی مبعوث ہوا، اُس نے اپنی امت کو جھوٹے یک چشم سے ضرور خبردار کیا ہے۔ آگاہ رہو، وہ یک چشم ہے، جب کہ تمھارا رب یک چشم نہیں ہے۔ اور یہ بھی کہ اُس کی دونوں آنکھوں کے درمیان لفظ 'کافر' لکھا ہوا ہے، جسے ہر صاحب ایمان پڑھ لے گا، چاہے وہ اَن پڑھ ہو یا پڑھا لکھا ہو۔ (صحیح بخاری، رقم 7131)

جاوید احمد غامدی

قربانی

دنیا کے تمام مذاہب میں قربانی اللہ تعالیٰ کے تقرب کا ایک بڑا ذریعہ رہی ہے۔ اِس کی حقیقت وہی ہے جو زکوٰۃ کی ہے، لیکن یہ اصلاً مال کی نہیں، بلکہ جان کی نذر ہے جو اُس جانور کے بدلے میں چھڑا لی جاتی ہے جسے ہم اِس کا قائم مقام بنا کر قربان کرتے ہیں۔

قربانی کی تاریخ

اِس کی تاریخ آدم علیہ السلام سے شروع ہوتی ہے۔ قرآن میں بیان ہوا ہے کہ اُن کے دو بیٹوں، (ہابیل اور قابیل) نے اپنی اپنی نذر اللہ تعالیٰ کے حضور میں پیش کی تو ایک کی نذر قبول کر لی گئی اور دوسرے کی قبول نہیں ہوئی۔ بائیبل میں صراحت ہے کہ ہابیل نے اِس موقع پر اپنی بھیڑ بکریوں کے کچھ پہلونٹے بچوں کی قربانی پیش کی تھی۔ یہ طریقہ بعد میں بھی، ظاہر ہے کہ قائم رہا ہو گا۔ چنانچہ اِس کے آثار ہم کو تمام مذاہب میں ملتے ہیں۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی قربانی کے بعد، البتہ جو اہمیت و عظمت اور وسعت و ہمہ گیری اِس عبادت کو حاصل ہوئی ہے، وہ اِس سے پہلے، یقیناً حاصل نہیں تھی۔ اُنھیں جب یہ ہدایت کی گئی کہ وہ بیٹے کی جگہ جانور کی قربانی دیں تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم نے اسمٰعیل کو ایک ذبح عظیم کے عوض چھڑا لیا ہے۔ اِس کے معنی یہ تھے کہ

ابراہیم کی یہ نذر قبول کر لی گئی ہے اور اب پشت بہ پشت لوگ اپنی قربانیوں کے ذریعے سے اِس واقعے کی یاد قائم رکھیں گے۔ حج و عمرہ کے موقع پر اور عید الاضحیٰ کے دن یہی قربانی ہے جو ہم ایک نفل عبادت کے طور پر پورے اہتمام کے ساتھ کرتے ہیں۔

قربانی کا مقصد

اِس کا مقصد اللہ تعالیٰ کی شکر گزاری ہے۔ ہم اپنی جان کا نذرانہ قربانی کے جانوروں کو اُس کی علامت بنا کر بارگاہ خداوندی میں پیش کرتے ہیں تو گویا اسلام و اخبات کی اُس ہدایت پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں جس کا اظہار سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے اپنے اکلوتے فرزند کی قربانی سے کیا تھا۔ اِس موقع پر تکبیر و تہلیل کے الفاظ اِسی مقصد سے ادا کیے جاتے ہیں۔ یہ، اگر غور کیجیے تو پرستش کا منتہاے کمال ہے۔ اپنا اور اپنے جانور کا منہ قبلہ کی طرف کر کے اور 'بِسْمِ اللّٰہِ، وَاللّٰہُ اَکْبَرُ' کہہ کر ہم اپنے جانوروں کو قیام یا سجدے کی حالت میں اِس احساس کے ساتھ اپنے پروردگار کی نذر کر دیتے ہیں کہ یہ درحقیقت ہم اپنے آپ کو اُس کی نذر کر رہے ہیں۔

قربانی کا قانون

اِس کا قانون یہ ہے: قربانی انعام کی قسم کے تمام چوپایوں کی ہو سکتی ہے۔ اِس کا جانور بے عیب اور اچھی عمر کا ہونا چاہیے۔ قربانی کا وقت یوم النحر 10/ ذوالحجہ کو عید الاضحیٰ کی نماز سے فراغت کے بعد شروع ہوتا ہے۔ اِس کے ایام وہی ہیں جو مزدلفہ سے واپسی کے بعد منیٰ میں قیام کے لیے مقرر کیے گئے ہیں۔ اصطلاح میں اِنھیں 'ایام تشریق' کہا جاتا ہے۔ قربانی کے علاوہ اِن ایام میں یہ سنت بھی قائم کی گئی ہے کہ ہر نماز کی جماعت کے بعد تکبیریں کہی جائیں۔ نمازوں کے بعد تکبیر کا یہ حکم مطلق ہے۔ اِس کے کوئی خاص الفاظ شریعت میں مقرر نہیں کیے گئے۔ قربانی کا گوشت لوگ خود بھی بغیر کسی تردد کے کھا سکتے اور دوسروں کو بھی کھلا سکتے ہیں۔

سید منظور الحسن

شق القمر

غامدی صاحب کا موقف

[محمد حسن الیاس کے ساتھ ایک مکالمے سے لیا گیا]

(11)

— 4 —

انفس و آفاق کی جملہ آیاتِ الٰہی کو بیان کرنے والی آیاتِ قرآنی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے مقاصد میں سے ایک مقصد تلاوتِ آیات بھی تھا۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنے فرستادے کو قرآن میں مذکور دلائل و براہین سے لیس کر کے مبعوث فرمایا تھا۔ قرآنِ مجید میں اِس کے لیے 'یَتْلُوْا عَلَیْھِمْ اٰیٰتِکَ' کے الفاظ آئے ہیں۔ اِس سے مراد اللہ کی آیتوں کو پڑھ کر سنانا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جب قرآنِ مجید کے مندرجات کو پڑھ کر سنایا

تو در حقیقت اِسی مقصد کو پورا فرمایا۔ یعنی آپ نے قرآنِ مجید کی صورت میں اُس کلام کو پڑھ کر سنایا، جو اللہ کی قدرت و حکمت، خلق و تدبیر اور دیگر صفات پر انفس و آفاق کے دلائل کو بیان کرتا ہے۔ اِس کا ہر جملہ ایسی دلیل و برہان کی حیثیت رکھتا ہے، جس سے اللہ کی صفات، اُس کے احکام اور اُس کی مرضیات کا علم ہوتا ہے۔ اِسی اعتبار سے قرآنِ مجید کے کلمات و ارشادات بھی بہ منزلۂ آیات ہیں اور اِسی بنا پر اُنھیں آیات قرار دیا گیا ہے۔

'یَتْلُوْا عَلَیْھِمْ اٰیٰتِکَ' کے مذکورہ الفاظ سورۂ بقرہ میں سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی دعا کے طور پر نقل ہوئے ہیں۔ ارشاد ہے:

رَبَّنَا وَ ابْعَثْ فِیْھِمْ رَسُوْلًا مِّنْھُمْ یَتْلُوْا عَلَیْھِمْ اٰیٰتِکَ وَ یُعَلِّمُھُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ وَیُزَکِّیْھِمْ.... (129:2)

"پروردگار، اور اُنھی میں سے تو اُن کے اندر ایک رسول اٹھا، جو تیری آیتیں اُنھیں سنائے اور اُنھیں قانون اور حکمت سکھائے اور اِس طرح اُنھیں پاکیزہ بنائے...۔"

استاذِ گرامی جناب جاوید احمد غامدی اِس کی وضاحت میں لکھتے ہیں:

"آیت عربی زبان میں اُس چیز کو کہتے ہیں، جس سے کسی چیز پر دلیل لائی جائے۔ قرآن کا ہر جملہ کسی نہ کسی حقیقت کے لیے دلیل و برہان کی حیثیت رکھتا ہے۔ اِس کے لیے آیت کا لفظ اِسی رعایت سے اختیار کیا گیا ہے۔ آیتیں سنانے کے لیے اصل میں 'یَتْلُوْا عَلَیْھِمْ' کے الفاظ آئے ہیں۔ یہ اُس زور و اختیار کو ظاہر کرتے ہیں، جس کے ساتھ اللہ کا رسول اُس کے سفیر کی حیثیت سے لوگوں کو اُس کا فرمان پڑھ کر سناتا ہے اور پھر خدا کی عدالت بن کر اُس کا فیصلہ اُن پر نافذ کر دیتا ہے۔" (البیان 1/ 131)

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے سورۂ بقرہ کی آیت 39 کے الفاظ 'وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَکَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَآ' میں لفظِ آیت کے مفہوم کو اِسی پہلو سے بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"آیت کے اصل معنی اُس نشانی یا علامت کے ہیں، جو کسی چیز کی طرف رہنمائی کرے۔ ... کہیں کتاب اللہ کے فقروں کو آیات کہا گیا ہے، کیونکہ وہ نہ صرف حق اور صداقت کی طرف رہنمائی کرتے ہیں، بلکہ فی الحقیقت اللہ کی طرف سے جو کتاب بھی آتی ہے، اُس کے محض مضامین ہی میں نہیں، اُس کے الفاظ اور اندازِ بیان اور طرزِ عبارت تک میں اُس کے جلیل القدر

مصنف کی شخصیت کے آثار نمایاں طور پر محسوس ہوتے ہیں۔" (تفہیم القرآن 1 / 69)

چنانچہ قرآنِ مجید میں جابجا اِس کی مثالیں موجود ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جہاں انفس و آفاق کے دلائل کو آیات قرار دیا ہے، وہاں قرآن کے فقروں اور جملوں کے لیے بھی یہی لفظ استعمال کیا ہے۔ مثال کے طور پر سورۂ احقاف میں ارشاد فرمایا ہے:

وَاِذَا تُتْلٰی عَلَیْهِمْ اٰیٰتُنَا بَیِّنٰتٍ قَالَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لِلْحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمْ ۙ هٰذَا سِحْرٌ مُّبِیْنٌ. (7:46)

"اِنھیں جب ہماری کھلی کھلی آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو یہ منکرین حق کے بارے میں، جب کہ وہ اِن کے پاس آگیا ہے، کہتے ہیں کہ یہ تو کھلا ہوا جادو ہے۔"

تاہم، یہ بات ملحوظ رہنی چاہیے کہ جب قرآنِ مجید میں یہ لفظ قرآن کے فقروں کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے تو اِس کے نتیجے میں 'آیت' کا اصل معنی و مفہوم اِس سے الگ نہیں ہوتا۔ یعنی جب قرآن اپنے متن کے اجزا کے لیے 'آیت' کا لفظ استعمال کرتا ہے تو دلیل اور نشانی کا مفہوم اُس کے اندر برقرار رہتا ہے، وہ اُس سے منفک نہیں ہوتا۔

سورۂ جاثیہ کا درجِ ذیل مقام ملاحظہ کیجیے۔ یہ بات پوری صراحت سے نمایاں ہو گی کہ لفظِ آیت استعمال تو قرآن کی عبارت کے لیے ہوا ہے، مگر اِس میں انفس و آفاق کے دلائل کا مفہوم پوری طرح شامل ہے:

تِلْكَ اٰیٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَیْكَ بِالْحَقِّ ۚ فَبِاَیِّ حَدِیْثٍ بَعْدَ اللّٰهِ وَ اٰیٰتِهٖ یُؤْمِنُوْنَ. وَیْلٌ لِّكُلِّ اَفَّاكٍ اَثِیْمٍ ۙ.

"یہ اللہ کی آیتیں ہیں، جنھیں ہم حق کے ساتھ تمھیں سنا رہے ہیں تو اللہ اور اُس کی آیتوں کے بعد اور کون سی بات ہے، جس پر یہ ایمان لائیں گے! تباہی ہے ہر اُس جھوٹے بداعمال کے لیے۔

یَّسْمَعُ اٰیٰتِ اللّٰهِ تُتْلٰی عَلَیْهِ ثُمَّ یُصِرُّ مُسْتَكْبِرًا كَاَنْ لَّمْ یَسْمَعْهَا ۚ فَبَشِّرْهُ بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ. وَاِذَا عَلِمَ مِنْ اٰیٰتِنَا شَیْـًٔا اتَّخَذَهَا هُزُوًا ؕ اُولٰٓئِكَ

جو اللہ کی آیتیں سنتا ہے، وہ اُس کو پڑھ کر سنائی جا رہی ہیں، پھر بھی تکبر کے ساتھ اپنی ضد پر اڑا رہتا ہے، گویا اُس نے وہ سنی ہی نہیں ہیں۔ (یہ اُس کا رویہ

لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ؕ .

ہے)، سو اُسے ایک دردناک عذاب کی خوش خبری سنا دو۔ اور ہماری آیتوں میں سے (اِسی طرح) اُسے جب کسی بات کا علم ہوتا ہے تو اُس کو مذاق بنالیتا ہے۔ یہی ہیں جن کے لیے ذلت کا عذاب ہے۔

مِنْ وَّرَآىِٕهِمْ جَهَنَّمُ ۚ وَ لَا يُغْنِيْ عَنْهُمْ مَّا كَسَبُوْا شَيْـًٔا وَّلَا مَا اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْلِيَآءَ ۚ وَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ. هٰذَا هُدًى ۚ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَهُمْ عَذَابٌ مِّنْ رِّجْزٍ اَلِيْمٌ. (6-11:45)

اِن کے آگے جہنم ہے اور جو کچھ بھی اِنھوں نے (دنیا میں) کمایا ہے، وہ اِن کے ذرا بھی کام آنے والا نہیں ہے اور نہ وہ جن کو اِنھوں نے اللہ کے سوا کارساز بنا رکھا ہے، اِن کے کچھ کام آئیں گے اور اِن کے لیے بڑا عذاب ہے۔ یہ قرآن اصل ہدایت ہے اور جو اپنے پروردگار کی آیتوں کے منکر ہیں، اُن کے لیے ایک دردناک عذاب ہے، ایسا کہ کپکپی پیدا کر دے۔‘‘

امام امین احسن اصلاحی نے اِس مقام کی جو تفصیل کی ہے، اُس سے آیتِ قرآن کے مفہوم کی حقیقت پوری طرح آشکار ہو جاتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

’’’تِلْكَ‘ کا اشارہ آفاق و انفس کی اُنھی نشانیوں کی طرف ہے، جو اوپر کی آیات میں مذکور ہوئیں۔ فرمایا کہ اللہ کی توحید، اس کی قدرت و حکمت اور اُس کے روزِ جزا و سزا کی یہ نشانیاں ہیں، جو اِس قرآن کے ذریعہ سے ہم تم کو، اُن کے صحیح نتائج و لوازم کے ساتھ، پڑھ کر سنا رہے ہیں۔ یہ نشانیاں اِس قدر واضح ہیں کہ کوئی ذی ہوش اِن کا انکار نہیں کر سکتا۔ اِنھی کے واقعی نتائج و لوازم کو قرآن تسلیم کرنے کی دعوت دے رہا ہے۔ اگر تمھارے یہ مخالفین اِن نشانیوں کے بدیہی نتائج کو تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہیں تو اب اِن سے زیادہ عقل اور دل کو مطمئن کرنے والی اور کون سی چیز ہو سکتی ہے، جس پر ایمان لائیں گے!

'نَتۡلُوهَا عَلَيۡكَ بِالۡحَقِّ' میں 'بِالۡحَقِّ' سے مراد وہ قطعی اور حقیقی نتائج ہیں، جو اِن نشانیوں پر غور کرنے سے سامنے آتے ہیں۔ یہ قید اِس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہی ہے کہ جہاں تک اِن نشانیوں پر غور کرنے کا تعلق ہے، اِن پر غور تو دوسرے بھی کرتے ہیں، لیکن وہ اپنے مخصوص اور نہایت محدود زاویہ سے غور کرتے ہیں، اِس وجہ سے یا تو اُن حقائق تک پہنچ نہیں پاتے، جو اِن کے اندر مضمر ہیں یا پہنچتے تو ہیں، لیکن چونکہ وہ اُن کے نفس کی خواہشوں کے خلاف ہیں، اِس وجہ سے اُن کے اعتراف سے گریز کرتے ہیں۔ مثلاً آسمان و زمین کی نشانیوں پر فلکیات و ارضیات کے ماہرین بھی غور کرتے ہیں۔ انسان کی خلقت پر اناٹومی (Anatomy) والے بھی تحقیق کرتے ہیں، حیوانات کے مختلف پہلوؤں پر علم الحیوانات والے بھی سر کھپاتے ہیں، رات اور دن کی گردش، بارشوں کے اوقات و اثرات اور ہواؤں کے تغیر و تبدل پر موسمیات والے بھی بہت کچھ ہوا باندھتے ہیں، لیکن اِن سب کا حال اِن کی تنگ نظری کے سبب سے یہ ہے کہ یہ اپنی دوربینوں اور خوردبینوں سے تِل کو تو دیکھ لیتے ہیں، لیکن تل کے اوٹ کا پہاڑ اِن کو نظر نہیں آتا۔ موسمیات والے یہ پیشین گوئی تو کر دیں گے کہ آگے چوبیس گھنٹے موسم گرم و خشک رہے گا اور اُس کی کوئی الٹی سیدھی توجیہ بھی کر دیں گے۔ اکثر حالات میں اُن کی پیشین گوئی صحیح بھی ثابت ہوتی ہے اور بعض حالات میں اُن کی پیش کردہ توجیہ سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا، لیکن اُن کی نگاہ صرف ہواؤں کے تصرف کی نوعیت اور اُس کے اثرات کا اندازہ کرنے تک محدود رہ جاتی ہے۔ اِس سے آگے بڑھ کر وہ اِس سوال پر غور کرنے کی زحمت نہیں اٹھاتے کہ اِن تصرفات کے پس پردہ حقیقی مصرف کون ہے اور اُس کے حقوق و فرائض کیا ہیں! حالانکہ کائنات کے اندر یہ تمام تصرفات و تغیرات جو ہوتے ہیں، یہ اِسی لیے ہوتے ہیں کہ انسان اِس اصل سوال تک پہنچے، اِس کا حل دریافت کرے اور اگر خدا کا کوئی بندہ اُس کو اِس سوال کا کوئی دل نشین حل بتائے تو اُس کو قبول اور اُس پر عمل کرے۔ قرآن نے اِن نشانیوں کے اِنھی پہلوؤں کو خاص طور پر بے نقاب کیا ہے، جو اصل حقیقت پر روشنی ڈالنے والے ہیں۔ اِس وجہ سے اِس کو 'نَتۡلُوۡهَا عَلَيۡكَ بِالۡحَقِّ' سے تعبیر فرمایا ہے۔

اِس سے ایک بڑی اہم حقیقت یہ واضح ہوئی کہ قرآن کی دعوت جبر یا تحکم پر مبنی نہیں ہے، بلکہ تمام تر آفاق و انفس کے واضح دلائل اور عقل و فطرت کے بینات پر مبنی ہے۔ جو لوگ اِن کو

نہیں مانتے، اُن کے نہ ماننے کی وجہ یہ نہیں ہے کہ یہ مخفی ہیں، بلکہ صرف یہ ہے کہ وہ اُن کو اپنے نفس کی خواہشوں کے خلاف پاتے ہیں، اِس وجہ سے اُن سے گریز کرنا چاہتے ہیں۔ جو لوگ اِس مرض میں مبتلا ہیں، ظاہر ہے کہ وہ کوئی بھی ایسی بات ماننے کو تیار نہیں ہو سکتے، جو اُن کی خواہش کے خلاف ہے، اگرچہ وہ سورج سے بھی زیادہ روشن ہو کر اُن کے سامنے آئے۔

دوسری حقیقت یہ واضح ہوئی کہ اِس کائنات میں سب سے زیادہ بدیہی، بلکہ ابدہ البدیہیات اللہ اور اُس کی نشانیاں ہیں۔ جو لوگ اُن کے منکر ہیں، وہ کسی بھی حقیقت کو ماننے کے اہل نہیں ہیں۔ وہ محض اپنی خواہشوں کے غلام، اپنے پیٹ اور تن کے پجاری ہیں۔ اِس طرح کے لوگ اگر کچھ نئی نشانیوں اور معجزات کا مطالبہ کریں تو اُن کے مطالبات لائق توجہ نہیں ہیں۔ اِس طرح کے اندھوں کی آنکھیں کوئی بڑے سے بڑا معجزہ بھی نہیں کھول سکتا۔“

(تدبر قرآن 7/ 306-307)

[باقی]

محمد ذکوان ندوی*

رفقاے ”المورد“ کے نام

[زیر نظر تحریر اصلاً ایک خط پر مبنی ہے۔ اِس کی عمومی اشاعت مطلوب نہیں تھی۔ تاہم حال میں اِسے دیکھ کر رفقاے ”المورد“، خصوصاً برادرم محمد حسن الیاس (ڈائریکٹر ریسرچ اینڈ کمیونیکیشن، غامدی سینٹر، امریکہ) نے کھلے دل سے قدر افزائی کرتے ہوئے اصرار فرمایا کہ اِسے ضرور شائع کیا جائے۔ لہٰذا، اب بعد از نظر ثانی اِسے رفقا و ناظرین کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔

راقم مختلف مکاتبِ فکر، مدارس، اسکول و کالج اور متعدد نیشنل اور انٹرنیشنل، دونوں طرح کے اداروں اور افراد سے بہت قریبی طور پر وابستہ رہا ہے۔ تاہم، تجربات شاہد ہیں کہ اِن تمام مذہبی اور غیر مذہبی اداروں کے درمیان ”المورد“ وہ واحد ادارہ ہے جو علمی تنقید اور افراد کی قدردانی کے معاملے میں اب تک ایک استثنائی ادارہ ثابت ہوا ہے۔ یہاں نہ صرف بشاشت کے ساتھ تنقید سننے، بلکہ اپنے خلاف باتوں کی اشاعت اور اُس کی حوصلہ افزائی کا ایک استثنائی ماحول پایا جاتا ہے۔ چنانچہ اپنے نقطۂ نظر پر اب تک کی گئی تمام علمی تنقیدات کو ”المورد“ نے خود باقاعدہ اپنی ذاتی ویب سائٹ پر شائع کر دیا ہے۔ دوسرے متعدد تجربات کے علاوہ، زیر نظر تحریر خود اِس علمی اور اخلاقی

* ایڈیٹر ماہنامہ ”اشراق ہند“۔

طرزِ عمل کا ایک زندہ ثبوت ہے۔

زیر نظر خط دیکھنے کے بعد ''المورد'' کے تمام احباب نے نہ صرف اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا، بلکہ اِس پر نظر ثانی کر کے اِسے ایک خط کے بجاے ایک مستقل تحریر کی صورت دینے کا مشورہ دیا، تاکہ اِس کی افادیت واضح ہو اور لوگ سنجیدگی کے ساتھ اِس پر توجہ دے سکیں۔ چنانچہ پہلے اِس کو علیٰ حالہ ماہنامہ ''اشراق امریکہ'' کے صوتی اور تحریری، دونوں ایڈیشن (مئی 2024ء) میں شائع کیا گیا۔ البتہ، اب مزید اضافہ و نظر ثانی کے بعد دوبارہ اِس کو شائع کیا جا رہا ہے۔

یہ برتر علمی اور اخلاقی روایت ''المورد'' کے محترم بانی اور مربی استاد جاوید احمد غامدی نے مسلسل خود اپنے قول اور عمل سے قائم فرمائی ہے۔ یہ وہ عظیم عملی نمونہ ہے جسے لازماً ہمارے اداروں کو اختیار کرنا چاہیے۔ اِس کے بغیر نہ کوئی منظم اور کارآمد ٹیم بن سکتی ہے، اور نہ مطلوب انداز میں کبھی ایک کامیاب ادارے کو چلایا جا سکتا ہے۔ جس ادارے میں خوے دل نوازی اور قدر دانی کا فقدان ہو اور جہاں کھلے ذہن کے ساتھ اپنے خلاف سننے اور اُس کی علیٰ الاعلان حوصلہ افزائی کا یہ مطلوب ماحول نہ ہو، وہاں صرف مفاد پرستی، تملق اور فکری جمود ہو گا، نہ کہ علمی اور اخلاقی ارتقا۔ اِس نامطلوب صورتِ حال کے ذمے دار دوسرے لوگ نہیں، بلکہ صرف اداروں کے اربابِ حل و عقد ہیں۔ یہی لوگ خود شعوری یا غیر شعوری طور پر اپنے گرد اِس قسم کا دہرا ماحول پیدا کرتے ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اچھی یا بری روایت ہمیشہ بڑے لوگ قائم کرتے ہیں، نہ کہ چھوٹے لوگ۔ محمد ذکوان ندوی]

استاذِ گرامی جناب جاوید احمد غامدی کے ساتھ شعر وادب، فلسفہ وشریعت، اِسرا و معراج، حکمت و قانون، نکاح و طلاق، اصول و مبادی اور نظم کلام جیسے علمی موضوعات پر گفتگو بہت اہم اور قابل قدر ہے۔ ہم جیسے طلبہ کو چاہیے کہ وہ اِسے گہرائی کے ساتھ سمجھیں اور فکرِ فراہی پر مبنی اِس عظیم علمی روایت سے بھرپور انداز میں استفادہ کریں۔ علم دین سے دل چسپی رکھنے والے افراد کے لیے اِن مباحث کی تفہیم اور تحقیق کا کام، بلاشبہ ضروری ہے۔ فکری بصیرت اور علمی

استعداد کی اِس ضرورت سے ہرگز انکار نہیں کیا جاسکتا۔

تاہم، عالمی سطح کے پورے ایک ادارے اور اُس کے تمام افراد کا مستقل طور پر صرف چند مخصوص موضوعات تک محدود ہو کر رہ جانا ہرگز کوئی صحت مند طرزِ عمل نہیں ہو سکتا۔ یہ صورتِ حال اکثر علمی اور ذہنی ارتقا کے بجاے فکری جمود کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہے، کیونکہ یہ ایک نفسیاتی حقیقت ہے کہ جہاں سارے لوگ ایک ہی انداز میں سوچتے ہوں، وہاں عموماً جو کچھ ہوتا ہے، وہ ذہنی ارتقا نہیں، بلکہ صرف فکری اور ذہنی جمود ہوا کرتا ہے:

"When everyone thinks alike, no one thinks very much."

گروہی عصبیت اور تحزّب سے اجتناب

اِسی کے ساتھ، ہمارے لیے انتہائی حد تک ضروری ہے کہ ہم مسلسل اپنی اخلاقی روایت کے مطابق، اِسی طرح اپنے آپ کو تمام تعصبات سے محفوظ رکھنے کی کوشش کریں۔ استاذ جاوید احمد غامدی نے ایک قرآنی لفظ 'رِجْس'[1] کی وضاحت کرتے ہوئے ایک بار راقم سے فرمایا تھا کہ 'رِجس' کی بہت سی قسمیں ہیں۔ چنانچہ تعصب بھی 'رِجس' کی ایک قسم ہے۔ تعصب علم کا 'رِجس' ہے۔ تعصب حصولِ علم کے لیے نہ صرف ایک رکاوٹ ہے، بلکہ اِس سے علم اپنی خالص اور بے آمیز صورت میں باقی نہیں رہتا۔ تعصب علم کو آلودہ اور ذہن و فکر کو جامد بنا کر رکھ دیتا ہے۔

ایک زوال یافتہ قوم، بلاشبہ اکثر اپنے بڑے لوگوں کو نگل جاتی ہے۔ ایسے لوگوں کا نصف اوّل، عموماً افکار کا جنگل طے کرنے میں، اور نصف ثانی اِس قوم کے درمیان پھیلے ہوئے بے معنی مسائل و مباحث کا دنگل لڑنے میں گزر جاتا ہے۔ تاہم فکری اور تجدیدی نوعیت کے کام کا عزم لے کر اٹھنے والے افراد کے لیے ضروری ہے کہ وہ انتخابی طریقہ (selective pattern) اختیار کریں، تاکہ وقت اور توانائی کو متعین اہداف پر مرتکز رکھ کر مطلوب کام انجام دیا جاسکے۔

---

[1] ۔یونس 100:10۔

یہ ہمارا اخلاقی فریضہ ہے کہ ہم بہر صورت تہِ دل سے اپنے اساتذہ کا احترام کریں۔ تاہم، بہتر ہو گا کہ اِن جلیل القدر علما اور اساتذہ کے لیے ہم 'قبلہ و امام' جیسے تقدیسی پس منظر رکھنے والے القاب کے بجاے 'استاد' اور 'معلم' (بُعِثتُ مُعَلِّمًا) جیسے معزز علمی الفاظ کا استعمال کریں۔ ہمیں اپنے درمیان القاب سازی کے اُس مبتدعانہ کلچر کو ہر گز فروغ نہیں دینا چاہیے جو صرف مابعدِ رسالت دور میں پیدا ہونے والا ایک عجمی ظاہرہ ہے۔ اِس قسم کا ظاہرہ بہ تدریج اِن جلیل القدر علما اور اساتذہ کے لیے 'بے خطا' (infallible) اور 'برتر از زندگی' (larger-than-life) جیسے غلو آمیز تصورات کی افزایش کا سبب بنے گا، جو اخلاقی بلندی اور علمی ارتقا، دونوں کے لیے قاتل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اِس طرح جمود، تفرقہ اور گروہ بندی کا وہ نامطلوب ظاہرہ پیدا ہو گا جسے قرآن میں سخت معیوب قرار دیا گیا ہے۔[2]

دینی عمل کا مطلوب معیار

''المورد'' دینی موضوعات پر تحریر و تحقیق اور اُس کی نشر و اشاعت پر مبنی ایک علمی اور دعوتی ادارہ ہے۔ اِس طرح کے اداروں سے وابستہ افراد کے لیے ضروری ہے کہ وہ ہمیشہ اِس حقیقت کا زندہ استحضار رکھیں کہ صرف ایمان و اخلاق کی روح ہماری کامیابی اور ناکامی کا اصل معیار ہے۔

مجرد تحریر و تحقیق کرنا، خطابت کے جوہر دکھانا، صوتی اور بصری پروگرام بنانا، کتب اور رسائل کا کاغذی دفتر تیار کرنا اور مضامینِ نو کا انبار لگا دینا ہر گز کوئی دینی عمل نہیں۔ مقبول دینی عمل[3] وہی ہے جس میں تقویٰ و اخلاص کارفرما ہو، جس سے خود آدمی کے اندر خوفِ خدا[4] کا جذبہ بیدار ہو اور اُس کی اپنی شخصیت کے اندر ربانیت[5] اور تزکیۂ نفس کا عمل جاری ہو سکے۔

ایمان و اخلاق کوئی الگ چیز نہیں، اِس سے مراد وہی چیز ہے جسے قرآن میں بار بار ایمان

---

[2]۔ الروم 30:32-31۔

[3]۔ المائدہ 5:27۔

[4]۔ المومنون 23:60۔ الدہر 76:10۔

[5]۔ آل عمران 3:79۔

اور عمل صالح کے الفاظ میں بیان کہا گیا ہے، یعنی خدا ے برتر کی ذات وصفات پر سچا یقین اور اِسی یقین واذعان کے مطابق، عملاً اپنی پوری زندگی کی تعمیر و تشکیل۔

اِس حقیقت پر عمل پیرا ہوئے بغیر تحریر و تحقیق کی حیثیت محض ایک ایسے سیکولر کام کی ہو گی جس کی توفیق اِس دنیا میں کبھی ایک غیر دینی شخص کو بھی مل جاتی ہے 'وإنَّ اللّٰہَ لَیُؤَیِّدُ ھذا الدِّینَ بالرَّجُلِ الفاجِرِ'۔[6]

اِس طرح کا ایک کام اُس وقت تک دینی عمل کا مصداق اور تزکیۂ نفس کا محرک نہیں بن سکتا، جب تک وہ ایمان واخلاق کے تقاضوں کو زندہ کرنے اور اُس پر عملی تحریک کا ذریعہ ثابت نہ ہو۔

اِس روح کے بغیر دعوت، تعلیم اور تحریر و تحقیق جیسے یہ تمام مظاہر صرف حبطِ اعمال[7] کا مصداق بن کر رہ جائیں گے، خداوندِ ذوالجلال کے نزدیک اُن کی حیثیت ایک پرِ کاہ کے برابر بھی نہیں ہو سکتی۔ اِس اصل محرک کے بغیر عمل کی ابدی میزان میں اِن بے روح سرگرمیوں اور سیاہ و بے نور لکیروں کا ہرگز نہ کوئی وزن و تاثر ہو سکتا ہے، اور نہ ہی یہ مظاہر رضاے الٰہی اور رحمت و بخشش کا سبب بن سکتے ہیں۔

اِس کے برعکس ایمان واخلاق اور صدق واخلاص کے ساتھ کیا جانے والا عمل تزکیۂ نفس اور رضاے الٰہی کا ذریعہ ثابت ہو گا۔ یہی تزکیہ واخلاص ہماری صفوں میں اتحاد پیدا کرنے اور ہر حال میں ہمیں ایک بنیانِ مرصوص[8] کی طرح متحد ہو کر محض اللہ کی رضا، انسانیت کی بھلائی اور اُس کی ابدی فلاح و بہبود کے لیے تعلیم و دعوت اور علم و تحقیق کے مطلوب کاموں کا پاکیزہ اور طاقت ور حوصلہ عطا کرے گا۔

علم اور معلومات کا فرق

خدا کے دین میں علم سے مراد مجرد تعلیم و دعوت، تحریر و تحقیق اور صرف معلومات کا دفتر ہرگز

---

[6]۔ بخاری، رقم 6606۔ مسلم، رقم 111۔

[7]۔ ہود 16:11۔

[8]۔ الصف 4:61۔

نہیں، بلکہ علم سے مراد ایمان واخلاق کے تقاضوں کی تعمیل ہے۔ قرآن میں ایسے ہی لوگوں کو اہل علم اور اہل عقل[9] قرار دیا گیا ہے، جو ایمان واخلاق اور خشیت[10] کے اِن اوصاف سے بہرہ ور ہوں۔

چنانچہ صرف اُنھی لوگوں کو اہل علم[11] تسلیم کیا گیا ہے جو دنیوی زینت، شہرت ووجاہت، مادی منفعت، زر وزمین کی بہتات اور عہدہ ومنصب جیسی عارضی چیزوں کے مقابلے میں ہمیشہ ایمان، عمل صالح اور صدق واخلاص جیسی ابدی چیزوں کو ترجیح دیں اور لوجہ اللہ، صبر وعزیمت کے ساتھ تاعمر اِسی راستے پر گام زن رہنے کی جدوجہد جاری رکھیں۔

نئی پیش رفت کی ضرورت

موجودہ حالات میں ضرورت ہے کہ دیگر متعلق صلاحیتوں کے حامل افراد مروّجہ اور مخصوص قسم کے نظریاتی موضوعات پر کام کے ساتھ ساتھ انسانیت کو درپیش اُن دوسرے علمی، فکری اور عملی امور کو بھی اپنے کام اور تحقیق کا موضوع بنائیں جو اِس عہدِ نو، خصوصاً مابعد کورونا (Post-Corona) دور میں پوری انسانیت کے سامنے مزید شدت کے ساتھ ابھر کر آ گئے ہیں۔

مثلاً موجودہ زمانے میں خود دوا اور بنیادی غذائی اشیا میں پیدا کردہ عظیم فساد (GMOs) اور دیگر خلافِ فطرت سرگرمیوں کی بنا پر 'تغییرِ خلق'[12] کا مہلک ترین چیلنج انسانیت کو درپیش ہے۔ اِس کے ذریعے سے عملاً ہر سطح پر انسان کو غیر انسان بنائے جانے (dehumanization) کا عمل انتہائی تیزی کے ساتھ جاری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ٹرانس ہیومن ازم (trans-humanism) یا ماورائے انسانیت دور میں اب بار بار یہ کہا جا رہا ہے کہ بہ طورِ انسان غالباً یہ ہماری آخری صدی ہو گی۔

مشہور برطانوی سائنس دان اسٹیفن ہاکنگ (وفات: 2018ء) نے اِس خطرے کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا کہ 'مشینی ذہانت' کا یہ لامتناہی ارتقا خود انسانی نسل کے خاتمے کی قیمت پر ہو گا:

---

[9] ۔الزمر 9:39۔

[10] ۔فاطر 28:35۔

[11] ۔القصص 80:28۔

[12] ۔النساء 119:4۔

"The development of full artificial intelligence could spell the end of the human race." [The Economic Times, March 14, 2018]

'تغییرِ خلق' کے اِن نامطلوب فسادات کے نتیجے میں نہ صرف مہلک بیماری اور عدمِ تغذیہ کا ناقابل تلافی بحران پیدا ہو گیا ہے، بلکہ اِس فساد کے ذریعے سے خود اُس جوہرِ فطرت اور روحِ آدمیت ہی کا خاتمہ کیا جا رہا ہے جو وحی اور رسالت کی اصل مخاطب ہے۔ لہٰذا، ہمیں غور کرنا چاہیے کہ جب خود انسان انسان نہ رہے، اُس وقت کوئی ربانی دعوت کس طرح موثر ثابت ہو سکتی ہے؟ ایسی حالت میں یہ سمجھنا مشکل نہیں کہ دوسرے مطلوب کاموں کے ساتھ اِس وقت ہمارا اوّلین ترجیحی کام کیا ہونا چاہیے۔

ایسی حالت میں، صرف بال و ناخن کے مسائل، تطہیر بدن کے احکام، ازدواجی عمل کے شرعی حدود، ڈاڑھی و پردہ کے آداب اور خواجہ سراؤں کے حقوق جیسے مباحث کی مسلسل تکرار کے بجاے ضرورت ہے کہ قرآنی رہنمائی کے تحت انسانیت کو درپیش دوسرے بہت سے اہم علمی اور عملی مسائل کو اپنا موضوع بنایا جائے۔ مثلاً صنفی انارکی، ازدواجی بحران، سرمایہ دارانہ جبر و استحصال، ماحولیاتی آلودگی، موسمی تبدیلی، گلوبل وارمنگ، مسکرات اور منشیات کا سرطانی پھیلاؤ اور تمام بنیادی اشیاے خور و نوش، حتیٰ کہ پانی اور ہوا جیسی عمومی اشیا کو مہلک کثافت اور کیمیائی فساد سے بچا کر پاکیزہ اور صحت بخش بنانے کا عملی حل، موبائل ایڈکشن، سوشل میڈیا سونامی، حقیقی دنیا کے بجاے مفروضہ دنیا (virtual world) کا چیلنج جس نے اصل معرکۂ حیات سے کاٹ کر آج کے 'ترقی یافتہ' آدمی کو غیر آدمی (dehumanized) بنا کر رکھ دیا ہے۔ اِسی طرح حقیقی زندگی (real life) کے بجاے فرضی زندگی (reel life) کے عظیم بحران کا چیلنج وغیرہ۔

کثیر لسانی اور کثیر الفنون صلاحیت کی ضرورت

اِس کام کے لیے ضروری ہے کہ ہمارے نوجوان اپنے اندر باقاعدہ طور پر کثیر لسانی اور کثیر الفنون صلاحیت (multilingual & multidisciplinary efficiency) پیدا کریں۔ مثلاً قدیم مذہبی صحائف کی اصل زبانوں میں لکھنے، پڑھنے اور بولنے میں سے کسی ایک یا تمام سطحوں کی صلاحیت پیدا کی جائے ـــــ عبرانی، آرامی، یونانی اور سنسکرت وغیرہ؛ نیز عربی و فارسی کے ساتھ

جرمن، ترکی، لاطینی، فرانسیسی اور انگریزی وغیرہ۔ اِس سے اُن کا ذہنی افق مزید وسیع ہو گا اور وہ زیادہ گہرائی کے ساتھ متعدد فکری ابعاد اور مختلف علمی جہات سے واقعات کا بھرپور تجزیہ کر سکیں گے۔ اِس ضروری استعداد کے بغیر اِس زمانے میں صرف مروّجہ قسم کے محدود ذہنی اور علمی پس منظر کے ساتھ تجدید واحیاے اسلام کا نازک کام مطلوب صورت میں انجام نہیں دیا جا سکتا۔

اِن ضروری 'آلات' کے بغیر نہ تاریخ کی عمیق برماکاری (deep drilling) کا وہ عمل ممکن ہے جو اصل حقائق کو بے نقاب کر سکے اور نہ چودہ صدیوں پر محیط عظیم فکری اور علمی ملبے کے نیچے دفن بہت سے خزائن و باقیات تک رسائی ممکن نظر آتی ہے۔ اِس معاملے کی اہمیت کا شعور اگر بیدار ہو جائے تو اچھا ذہن اور قوتِ حافظہ رکھنے والے طلبہ کے اندر اِس قسم کی کثیر لسانی اور کثیر الفنون صلاحیت پیدا کرنا کوئی مستبعد شے نہیں۔ غالباً اِسی طرح کے بہت سے خزانوں کو دیکھ کر اقبال نے ایک صدی قبل یہ صدا لگائی تھی:

مگر وہ علم کے موتی، کتابیں اپنے آبا کی
جو دیکھیں اُن کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے، سیپارہ

''المورد'' کی استثنائی نوعیت

الحمدللہ، اب تک ''المورد'' کے تحت کئی اسلامی موضوعات پر اہم ترین علمی اور تحقیقی کام کیا جا چکا ہے۔ اِس کام کو اگر ایک لفظ میں بیان کیا جائے تو وہ ہو گا: کتاب و سنت ـــــ مرکزی تصورِ دین کے اِحیا و تجدید کی عالمانہ جدوجہد۔ تاہم، اب اِسی کے ساتھ 'لائف کوچنگ' (life coaching) کے اہم ترین عصری اور انسانی موضوعات پر بھی ''المورد'' کے احباب جناب معز امجد، جواد احمد غامدی اور ڈاکٹر شہزاد سلیم جیسے سنجیدہ اور علم دوست افراد کے ذریعے سے انتہائی قابل قدر کام انجام پا رہا ہے۔

میرے علم کے مطابق ''المورد'' اپنے فکر و مقاصد کے اعتبار سے معروف معنوں میں نہ محض ایک روایتی قسم کا ادارہ ہے اور نہ اُس کے سنجیدہ اور ذی علم و صاحبِ فکر احباب میری طرح صرف مدرسے کے فارغ التحصیل ایک مولوی۔ ''المورد'' اپنے نظم و معیار، برتر اخلاقیات، ذوقِ جمال، اعلیٰ ادبی مذاق، علمی اور فکری وسعت اور رفقاے کار کے جدید عصری اور اسلامی، دونوں پس منظر رکھنے کی بنا پر شاید دوسرے بہت سے اداروں کی بہ نسبت زیادہ اِس پوزیشن میں ہے کہ وہ اپنے

پیش نظر دوسرے اہم مقاصد کی تکمیل کے ساتھ ساتھ وقت کے حقیقی اور زندہ مسائل کو زیادہ بہتر طور پر ایڈریس کرے۔ اِس طرح ''المورد'' کے لیے یہ ممکن ہو گا کہ وہ استاد جاوید احمد غامدی کے اِس عظیم خواب کی تعبیر بن سکے:

اِس زمانے کو بھی دیں اور زمانہ کوئی
پھر اُٹھیں، ولولۂ علم و ہنر تازہ کریں!

بعض مرتبہ عالمی پلیٹ فارم پر روایتی اور فرسودہ وغیر متعلق قسم کے مباحث اور لاحاصل فنی قیل و قال کی تکرارِ مسلسل دیکھ کر اکثر یہ خیال آتا ہے کہ جن چیزوں پر فراہی سے لے کر غامدی تک کے جلیل القدر اہل علم مسلسل لکھتے اور بولتے رہے ہیں، جدید بحرانی حالات میں بھی اُنھی مباحث پر اکتفا کر کے صرف چند مخصوص موضوعات پر بحث و تمحیص شاید اپنے وقت اور توانائی کا زیادہ بہتر استعمال نہیں۔ تاریخ کا فیصلہ ہر گز ہمارے متعلق وہ نہیں ہونا چاہیے جسے اقبال نے اِن الفاظ میں بیان کیا تھا:

کر سکتے تھے جو اپنے زمانے کی امامت
وہ کہنہ دماغ اپنے زمانے کے ہیں پیرو!

ہمیں شعوری طور پر اِس ابدی حقیقت سے باخبر رہنا چاہیے کہ ابھی ہمارا کام ختم نہیں ہوا۔ ابھی بہت سے پتھر الٹنا، بہت سی وادیاں طے کرنا اور بہت سی اُن دیواروں کا انہدام باقی ہے جو خدا اور اُس کے بندوں کے درمیان ایک مقدس 'ابدی چٹان' بن کر مسلسل طور پر حائل ہیں:

گماں مبر کہ بہ پایاں رسید کارِ مغاں
ہزار بادۂ ناخوردہ، در رگِ تاک است!

اِس صورتِ حال کو دیکھ کر بسا اوقت دل چاہتا ہے کہ اِس قسم کے مخلص اور باصلاحیت احباب سے اقبال کی زبان میں، غالب کے اِن معذرت خواہانہ اشعار کے ساتھ، عرض کیا جائے کہ:

میں جو گستاخ ہوں، آئین غزل خوانی میں
یہ بھی تیرا ہی کرم، ذوق فزا ہوتا ہے
رکھیو غالب، مجھے اِس تلخ نوائی میں معاف
آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے!

شاعرِ حقیقت علامہ اقبال کی یہ نوائے سروش ذیل میں ملاحظہ فرمائیں:

اے اہل نظر، ذوقِ نظر خوب ہے، لیکن
جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے، وہ نظر کیا!
بے معجزہ دنیا میں ابھرتی نہیں قومیں
جو ضربِ کلیمی نہیں رکھتا، وہ ہنر کیا!؟
آتی ہے دمِ صبح صدا عرش بریں سے
کھویا گیا کس طرح ترا جوہر ادراک!
کس طرح ہوا کند ترا نشتر تحقیق
ہوتے نہیں کیوں تجھ سے ستاروں کے جگر چاک!
باقی نہ رہی تیری وہ آئینہ ضمیری
اے کشتۂ سلطانی و ملائی و پیری!

مروّجہ روایات کی حمالی

واقعات کا گہرا اور بے لاگ تجزیہ بتاتا ہے کہ خلافتِ راشدہ کے بعد اٹھنے والے بہت سے عظیم مرتبہ اکابر ائمۂ فن واصول سے لے کر تادمِ تحریر ہمارے اکثر افراد صرف مروّجہ فنی، فقہی، کلامی، اصولی، اکتشافی اور رہبانی دنیا کے صحرا نورد اور 'قرون مشھود لھا بالخیر' کے بعد جاری تکییف (conditioning) کے تحت قائم اِجماع و تواتر کے اُس عظیم فکری اور مذہبی پشتارہ کی بے لوث 'حمالی'[13] پر مامور رہے ہیں جس کے بیش تر حصے کو اللہ اور رسول کا استناد حاصل نہیں۔ جو شخص یا گروہ تاریخ کی حمالی کے اِس بوجھ اور بصیرت کش تکییف کی اِس سیاہ دھند سے آزاد ہو کر روشن ضمیری اور بلند نظری کے ساتھ سوچنے کا حوصلہ رکھتا ہو، تاریخ کی امامت اب اُسی کا مقدر ہو گی:

ہے وہی تیرے زمانے کا امامِ برحق
جو تجھے حاضر و موجود سے بیزار کرے!

---

[13] ۔الجمعہ 62:5۔

موت کے آئنے میں تجھ کو دکھا کر رخِ دوست
زندگی اور بھی تیرے لیے دشوار کرے!

تاریخ کا گہرا مطالعہ بتاتا ہے کہ ہمارے درمیان عام، متداول اور رائج احباری روایت پر مبنی اِس پشتارے کا تانا بانا اکثر قرآنی اور نبوی منہاج کے بجاے 'لتتبعنّ سنن من کان قبلکم...'[14] اور 'لیأتینّ علی أمتی، ما أتی علی بنی إسرائیل، حذوَ النعل بالنعل...'[15] جیسی عظیم پیغمبرانہ اور چشم کشا پیشین گوئی کے مطابق، قدیم مذہبی 'تہوید، تنصیر اور تمجیس' (...فأبواہ یھودانہ، أو ینصرانہ، أو یمجسانہ. البخاری: 1385) پر قائم رہا ہے۔

چنانچہ اِس 'دین غریب' (إن ھذا الدین بدأ غریبًا، وسیعود غریبًا کما بدأ)[16] کا حال یہ ہے کہ اِس کا بڑا حصہ قرآنی اور نبوی فقہ اور ایمان و حکمت سے زیادہ اِسی مذکورہ 'مذہبی پشتارہ' سے مستفاد اور اِنھی کھوٹے اور کم عیار جواہرات سے مالا مال ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اِس خرمن مستعار کی خاکستر میں اکثر نبوی فقہ و تفقہ،[17] ایمان و اخلاق اور معرفتِ حق[18] کے سوا اور سب کچھ پایا جاتا ہے 'فیہ کلّ شیءٍ إلا الفقہ والإیمان'۔

ہمارے اکثر متعربین و متغربین اور قدیم و جدید جامعات کے فارغین اِسی زنداں کے اسیر اور اِسی مابعد عہدِ رسالت تکییف (Post-Prophetic Conditioning) پر قائم اُس شاکلے کی تقلیدِ محض پر مجبور دکھائی دیتے ہیں جسے 'خلافت علیٰ منہاج النبوہ'[19] کے بعد 'دین فطرت' اور 'دین سماحت' (بعثتُ بالحنیفیۃ السمحۃ) کی جگہ 'اِصر واَغلال'[20] پر مبنی ایک نئے احباری اور

---

[14] ۔ بخاری، رقم 3454۔ مسلم، رقم 2669۔

[15] ۔ ترمذی، رقم 2641۔ مستدرک الحاکم، رقم 444۔

[16] ۔ تخریج العواصم والقواصم، شعیب الأرنؤوط 7/309۔ مسلم، رقم 145۔

[17] ۔ التوبہ 9:122۔

[18] ۔ المائدہ 5:83۔

[19] ۔ 632ء-661ء۔

[20] ۔ الاعراف 7:157۔

رہبانی 'مذہب' کے طور پر رائج کیا گیا۔ اقبال نے درست طور پر کہا تھا:

سب اپنے بنائے ہوئے زنداں میں ہیں محبوس
خاور کے ثوابت ہوں کہ افرنگ کے سیار
پیران کلیسا ہوں کہ شیخان حرم ہوں
نے جدتِ گفتار ہے، نے جدتِ کردار

یہ اِسی عظیم فساد کا نتیجہ تھا کہ علماے حق گم نام، مطعون اور اکثر غیر موثر رہے اور ہمارے درمیان اصل فیصلہ کن عامل و بنیاد کی حیثیت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے بجاے عملاً صرف 'مذہبی' قیادت کو حاصل ہو گئی، اور 'کتاب و سنت'، دونوں بالآخر اُنھی کی تائید و تصویب پر منحصر ہو کر رہ گئے۔

چنانچہ عملاً یہ ہوا کہ مقتدیٰ اور میزان و فرقان کا وہ مقام جو صرف اللہ اور رسول کے لیے مخصوص تھا، وہ 'مذہبی علماے اصول' کو عطا کر دیا گیا۔ دینُ اللہ میں اِس فساد کا نتیجہ یہ ہوا کہ اصل 'قاعدہ' (کتاب و سنت) میں تحریف کا یہ عمل اِس معاملے میں گویا اُس بدنامِ زمانہ 'القاعدہ' کے ہم معنی بن گیا جو عملاً ایک ایسی فکری دہشت گردی ثابت ہوا جس کے نتیجے میں آزادانہ تحقیق کا دروازہ بند ہو گیا۔ چنانچہ اِس بحرانی صورتِ حال نے دینُ اللہ کے پورے ڈھانچے کو عملاً ڈائنامائٹ کر کے رکھ دیا۔

ظاہر ہے کہ جس نظامِ فکر میں نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کے بجاے 'احبار اور رہبان'[21] دینُ اللہ کے لیے میزان اور فرقان بن کر 'شارعِ اسلام' کے منصب پر فائز کر دیے جائیں تو پھر اِس زمین و آسمان کے نیچے اِس سے بڑا فساد اور کیا ہو سکتا ہے: 'مَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی عَلَی اللّٰہِ کَذِبًا اَوْ کَذَّبَ بِالْحَقِّ لَمَّا جَآءَہٗ'۔[22]

چنانچہ شعوری یا غیر شعوری طور پر یہ حال ہوا کہ ہمارے اکثر اربابِ علم باجبہ و دستار اِسی مابعد رسالت چھیڑے ہوئے ساز پر رقص کناں، اِسی کے صغریٰ و کبریٰ کی تنقیح اور اِسی کے متعین کردہ

---

[21]۔ التوبہ 9:31۔

[22]۔ ''اُس سے بڑھ کر ظالم کون ہو گا جو اللہ پر جھوٹ باندھے یا حق کو جھٹلائے، جب کہ وہ اُس کے پاس آ چکا ہے؟'' (العنکبوت 29:68)

منہج و خطوط کی بنیاد پر انتہائی سنجیدگی اور اخلاص کے ساتھ دادِ تحقیق دینے میں شب و روز مصروف رہے۔ تاہم اِس کے باوجود انسانیتِ عامہ اور ملتِ اسلامیہ کا قافلہ روز بہ روز 'ہدیٰ'[23] و صلاح کے بجاے 'ہویٰ'[24] و فساد کی طرف بڑھتا رہا اور اِس طرح، بالفاظِ قرآن، عملاً یہ ہوا کہ 'اصلاح'[25] کے بجاے گویا صرف 'فی سبیل اللہ فساد'[26] کا رول ہمارا مقدر بن کر رہ گیا۔

یہ تاریخ کا عجیب المیہ ہے کہ اب ہمارے اکثر ادارے اپنے مخصوص خول میں بند ہو کر عملاً صرف ایک قیمتی دارالاشاعت اور ایسے دار التراجم بن چکے ہیں، جہاں سے شائع ہونے والے لٹریچر کا بڑا حصہ، اپنی تمام تر افادیت کے باوجود، اصل علمی اور فکری سوالات کا جواب، انسانیت کے زخم کا مرہم، اُس کے درد کا درماں اور اُس کو درپیش مسائل کے حل و ادراک سے یکسر خالی نظر آتا ہے۔

چنانچہ اب یہاں ایسے لکھنے اور بولنے والوں کی کثرت ہے کہ "ابن مریم" کے مقام پر فائز ہونے اور مسیحائی کا مقدس لبادہ اوڑھ لینے کے باوجود اُن کے پاس انسانیت کے درد کی کوئی دوا نہیں۔ مرزا اسد اللہ خاں غالب نے شاید ایسے ہی کسی موقع پر کہا تھا:

ابن مریم ہوا کرے کوئی
میرے دکھ کی دوا کرے کوئی
شرع و آئین پر مدار سہی
ایسے قاتل کا کیا کرے کوئی

چنانچہ ہمارے درمیان اب عملاً ایسی سرگرمیاں جاری ہیں جو محض قومی اور زوال یافتہ و بے روح مذہبی فکر و مراسم کی نمایندہ ہیں۔ اِن میں سے اکثر سرگرمیاں نہ انسان رخی (human-oriented) ہیں اور نہ اِن میں انسانیتِ عامہ کی بھلائی اور اُس کی فلاح کا کوئی سنجیدہ اور واقعی

---

[23] ۔البقرہ 120:2۔

[24] ۔القصص 50:28۔

[25] ۔البقرہ 11:2۔

[26] ۔البقرہ 12:2۔

پروگرام نظر آتا ہے۔

خلاصۂ کلام

اب حالات کا تقاضا اور وقت کی پکار یہی ہے کہ نبی امی علیہ السلام کے سچے امتیوں میں ایسے خالص اور مخلص امیین (مابعد رسالت تکییف سے خالی افراد) اُٹھیں جو اِس خرمن مستعار کی خاکستر سے ایک نئی دنیا پیدا کریں، جو بے حسی اور مبتدعانہ روایت پرستی کا یہ طلسم توڑ کر دنیا کو علم، زندگی اور محبت کا تحفہ دے سکیں، جو اِس 'عالم ایجاد' میں 'صاحبِ ایجاد' بن کر کتاب و حکمت، عقل و فطرت اور پیغمبرانہ ہدایات پر مبنی 'علم و ایمان'[27] اور 'ربانیت و حسن اخلاق'[28] کی وہ عالم گیر دعوت، صداے لاہوتی اور وہ 'نغمۂ جبرئیل آشوب' بلند کر سکیں جو صدیوں سے جاری اِس احباری تقدس اور اِس فکری جمود کے لیے ایک 'ضربِ کلیم' ثابت ہو اور جس سے عالم افکار میں ایک ایسا زلزلہ برپا ہو جس کا آج شاید زمین و آسمان کو سب سے زیادہ انتظار ہے۔ یہ علمی، ایمانی، اخلاقی اور ربانی زلزلہ گویا صورِ اسرافیل سے پہلے ایک عظیم فکری بھونچال کے ہم معنی ہو گا:

دنیا کو ہے، اُس مہدیِ[29] برحق کی ضرورت
ہو جس کی نگہ زلزلہ عالم افکار!

اِس سمع خراشی اور طویل جگر کاوی کے بعد اب آپ کا یہ ظلوم و جہول دوست حافظ شیرازی (وفات: 1390ء) کے اِس شعر کے ساتھ آپ سے اجازت چاہتا ہے:

بال بگشا و صفیر از شجر طوبیٰ زن
حیف باشد چو تو مرغے کہ اسیر قفسی!

[لکھنؤ، 15/ستمبر 2020ء، نظر ثانی: مئی 2024ء]

---

[27]۔ الروم 30:56۔

[28]۔ الاسراء 17:39-23۔

[29]۔ یہاں 'مہدی' کا لفظ معروف اصطلاحی مفہوم میں نہیں، بلکہ یہ اپنے وسیع تر معنوں میں ایک بلیغ ادبی تلمیح کی حیثیت سے استعمال کیا گیا ہے، یعنی مابعد رسالت تکییف سے خالی انسان۔

نوا کہ چاہے تو پتھر کو جوے آب کرے
غیابِ قدرتِ یزداں کو بے نقاب کرے

ڈاکٹر عمار خان ناصر

برصغیر میں دیوبندی بریلوی مباحثات کا تاریخی پس منظر

[ڈاکٹر عمار خان صاحب ناصر کی یہ تحریر ”ادارۂ فکر جدید“ کے زیر اہتمام شائع ہونے والی کتاب ”جنوبی ایشیا میں مذہبی شناختوں کی تشکیل“ کا پیش لفظ ہے۔ اِس میں فاضل مصنف نے کتاب کے تعارف و تبصرے کے ساتھ اُس کے موضوع پر بھی کلام کیا ہے اور دیوبندی اور بریلوی مسالک میں نزاع کی علمی اساسات کو عمیق نظری سے بیان کیا ہے۔ اس اعتبار سے اس کی نوعیت پیش لفظ سے آگے بڑھ کر ایک عالمانہ تجزیے کی ہے۔ امید ہے کہ یہ تحریر جنوبی ایشیا کے دو بڑے مسالک کے اختلاف کو سمجھنے میں معاون ثابت ہو گی۔ واضح رہے کہ مذکورہ کتاب ڈاکٹر شیر علی ترین کی انگریزی تصنیف ”Defending Muhammad in Modernity“ کا اردو ترجمہ ہے۔ اِس میں جنوبی ایشیا میں دیوبندی اور بریلوی مسالک کی فکری کش مکش کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ مدیر]

اسلامی تاریخ کی ابتدا سے ہی مسلمانوں کے مابین مختلف دینی واعتقادی موضوعات پر بحث و مناظرہ کی روایت موجود رہی ہے۔ ابتدائی عہد میں ان مباحثوں کا مرکز زیادہ تر خدا کے تصور سے

متعلق اعتقادی سوالات تھے، مثلاً خدا کے علم اور انسانی ارادہ واختیار کا باہمی تعلق کیا ہے؟ قرآن میں خدا کی ذات کے لیے جو تشبیہی تعبیرات آئی ہیں، ان کو کیسے سمجھا جائے؟ اسی طرح یہ سوال بہ طور خاص زیرِ بحث تھا کہ وہ کون سے حدود ہیں جو ایمان اور کفر میں امتیاز قائم کرتے ہیں؟

انیسویں صدی میں جنوبی ایشیا میں ان مباحثوں میں ایک اہم تبدیلی یہ سامنے آئی کہ خدا کی ذات کے بجاے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت اعتقادی مباحثوں کا مرکز بن گئی۔ مذہبی مباحثوں کا ایک سلسلہ نمودار ہوا، جن کا تعلق اس نوعیت کے سوالات سے تھا کہ کیا پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو غیب کا علم حاصل ہے یا نہیں؟ کیا پیغمبر کا جسمانی وجود عام انسانوں کے مشابہ تھا یا ان سے مختلف؟ کیا پیغمبر کی ذات بھی عام انسانوں کی طرح زمان اور مکان کی پابندیوں کے تحت ہے یا پیغمبر کی ہستی بہ یک وقت کئی جگہوں پر موجود ہونے کی صلاحیت رکھتی ہے؟ کیا خدا کی طرف سے پیغمبر کو انسانوں کی زندگی کے معاملات میں تصرف واختیار کی خصوصی طاقت حاصل ہے یا نہیں؟ کیا خدا ایسی کوئی دوسری ہستی پیدا کر سکتا ہے جس کا رتبہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے برابر ہو؟

مسلمانوں کی اعتقادی بحثوں میں یہ سوالات حیرت انگیز طور پر ان اعتقادی بحثوں کا ایک عکس دکھائی دیتے ہیں جو سیدنا مسیح علیہ السلام کی ذات سے متعلق مسیحیوں میں پیدا ہوئیں، البتہ مسلمانوں کی مذہبی تاریخ میں ان بحثوں نے بہت بعد میں بنیادی طور پر جدید دور میں منظم شکل اختیار کی۔ جدید دور سے پہلے بھی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت کے ساتھ مافوق البشری اوصاف منسوب کرنے کا رجحان عوام الناس کے مبالغہ پسند تخیل میں موجود تھا، تاہم یہ سوالات واضح طور پر کلامی واعتقادی مباحث کا موضوع نہیں بنے تھے۔ علمی سطح پر ان تخیلات کا اظہار عموماً عالمِ وجود سے متعلق مختلف صوفی مفکرین کے پیش کردہ تصورات میں دکھائی دیتا ہے۔ ان تصورات کے مطابق عالم میں خدا کی الوہی حاکمیت کے تحت مختلف سطحوں پر بہت سی مقرب ہستیوں کی کارفرمائی ہے، جن میں سب سے برتر اور اعلیٰ ہستی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے۔ ان ہستیوں کے متعلق یہ مانا جاتا ہے کہ انھیں خدا کی طرف سے کچھ خصوصی مراتب اور اختیارات دیے جاتے ہیں۔ ان تصورات کی بنیاد پر عوام الناس کی سطح پر ایک خاص مذہبی ثقافت وجود میں آئی، جس کے نمایاں مظاہر میں مختلف صوفی بزرگوں کے مزاروں پر جانا اور اپنے مسائل و حاجات میں ان سے مدد مانگنا شامل ہے۔ تاہم تصوف یا روحانیت کے زیر سایہ رواج پانے والے

بہت سے اعمال پر تنقید بھی ہوتی رہی اور خود تصوف کے حلقوں میں اس حوالے سے اصلاحی مساعی کی ایک طویل روایت موجود رہی ہے۔ مثال کے طور پر ہندوستان میں مغلیہ عہد کی ابتدا سے ہی ممتاز مسلم مصلحین، مثلاً شیخ احمد سرہندی رحمہ اللہ اور ان کے بعد شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ عوام میں پھیلے ہوئے انحرافات اور بدعات پر، پرزور تنقید کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

پروفیسر عزیز احمد کے مطابق سولہویں صدی کے بعد ہندوستان سے سفرِ حج کا بنیادی راستہ بحیرۂ عرب بن گیا تھا، جو یورپی طاقتوں کی جہاز رانی کی بدولت ممکن ہوا۔ ہندوستان اور حجاز کے مابین ان نئے رابطوں نے بین الثقافت علمی تعلقات کا رخ ایران سے حجاز کی طرف موڑ دیا اور ہندوستان میں مذہبی اصلاح کے رجحانات کو مزید تقویت ملی۔ شیخ احمد سرہندی رحمہ اللہ (وفات 1624ء)، شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمہ اللہ (وفات 1642ء) اور شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ (وفات 1762ء) جیسے علما نے غالب صوفی روایت سے تعلق منقطع کیے بغیر بہت سے مروج عقائد اور اعمال پر سخت تنقید کی۔ مثلاً شاہ ولی اللہ نے اولیا کے مزاروں پر جا کر سجدہ کرنے اور ان سے مدد مانگنے والوں کو مشرکینِ عرب کے مماثل قرار دیا۔ انھوں نے مزید لکھا کہ اگر کوئی ان مشرکانہ عقائد کی ایک جھلک دیکھنا چاہے جن پر قرآن میں تنقید کی گئی ہے تو اسے اس دور کے ہندوستان میں عوامی سطح پر مروج تصوف کو دیکھ لینا چاہیے۔ گویا عوامی سطح پر مروج اعمال و رسوم پر تنقید کرنا استعماری دور میں سامنے آنے والا کوئی نیا مظہر نہیں تھا، بلکہ قبل از استعمار دور میں بھی مسلمان علما کے ہاں یہ رجحان جنوبی ایشیا اور دوسرے خطوں میں موجود تھا۔

تاہم برطانوی استعمار کے ہاتھوں مسلم سیاسی طاقت کے زوال نے شناخت کے ایک بحران کو جنم دیا اور بالکل نئے انداز کے مذہبی مجادلوں کا ایک ماحول پیدا کر دیا، جن کے موضوعات پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت کے مقام و مرتبہ اور عوام میں رائج مختلف مذہبی اعمال و رسوم تھے۔ اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے انتشار نے استعماری طاقت کو یہ موقع فراہم کیا کہ وہ جنوبی ایشیا میں ایک نئے سیاسی اور سماجی منظرنامے کی تشکیل کرے۔ اس مرحلے پر جنوبی ایشیائی اسلام میں پہلے سے موجود داخلی کشمکش اور تضادات میں بھی مزید شدت پیدا ہوئی۔ اٹھارہویں صدی کے آخر تک پرنٹنگ پریس نے ایک نیا میدان بھی پیدا کر دیا تھا جس میں مذہبی دعوت و تبلیغ کا سلسلہ عام لوگوں میں بڑے پیمانے پر وسیع کیا جا سکتا تھا۔ پیچیدہ اور گہری مذہبی بحثیں اب عوامی

دائرے میں چھیڑی جاسکتی تھیں اور نئے اہداف اور تصورات کے ساتھ ہم آہنگ نئے سیاسی مذہبی نظریات تشکیل دینے کے لیے ایک زرخیز زمین تیار تھی۔ اس سیاق میں، انیسویں صدی کے نصف اول میں شمالی مغربی ہندوستان میں جو صورت حال سامنے آئی، وہ اگرچہ پہلے سے جاری ایک اصلاحی تحریک کا نیا مرحلہ تھا، لیکن سیاسی اور سماجی نظام میں بنیادی نوعیت کی تبدیلیوں نے شاہ محمد اسماعیل رحمہ اللہ (وفات 1831ء) جیسے پرجوش مصلح کو اس قابل بنایا کہ وہ ایک ایسی دینی تحریک جاری کریں جو عوامی دائرے میں مستند مانے جانے والے عقائد اور نظریات کے جواز پر سوال اٹھاتی ہو اور بدعات اور انحرافات سے مسلم معاشرے کی تطہیر کو اپنا مقصد قرار دیتی ہو۔

شاہ اسماعیل کی تحریک جنوبی ایشیا کے اسلام میں مستند مذہبی عقائد کی از سر نو تعیین کی جدوجہد کا نقطۂ آغاز بنی۔ ان کا مذہبی موقف انتہائی ذہانت پر مبنی اور اپنے اثرات کے لحاظ سے عوام میں مقبول مذہبی بیانیے کے لیے تباہ کن تھا۔ شاہ اسماعیل رحمہ اللہ نے اپنی دعوت کا مرکزی نکتہ خدا کی توحید کو قرار دیا، اور اس عقیدے کو اس انداز سے پیش کیا کہ عوام کے مذہبی تصورات میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصی عظمت اور اختیارات سے متعلق پائی جانے والی مبنی بر غلو عقیدت کی نفی ہو جائے۔ اسلامی تصوف میں عالم وجود کے روحانی نظام کے سلسلۂ مراتب میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت چونکہ بلند ترین رتبے پر فائز مانی جاتی ہے، اس لیے کائنات کی تدبیر وانصرام کے خدائی نظام میں پیغمبر علیہ السلام کی کسی امتیازی حیثیت کی نفی سے یہ پوری عمارت زمیں بوس ہو جاتی ہے۔ اس مقصد کو سامنے رکھتے ہوئے شاہ اسماعیل رحمہ اللہ نے ارادتاً خدا کی توحید مطلق پر اصرار کرنے اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو کائناتی نظام میں مکمل طور پر خدا کی قدرت اور اختیار کے تابع باور کرانے کا طریقہ اختیار کیا اور اس کے لیے ایسی اضطراب انگیز اور سخت تعبیرات بھی اختیار کیں جن پر گستاخی اور توہین کے فتوے لگنا ناگزیر تھا۔ اس حوالے سے علامہ فضل حق خیر آبادی رحمہ اللہ کی تنقید زیر نظر کتاب میں تفصیلاً نقل کی گئی ہے، جب کہ ممتاز بریلوی عالم صدر الافاضل مولانا نعیم الدین مرادآبادی نے اپنی تنقیدات کا خلاصہ یوں بیان کیا ہے کہ:

> ”حضرات انبیا اور سید الانبیا علیہ وعلیہم الصلوٰۃ والسلام کی توہین وتنقیص کے کلمات اور بے ادبانہ بدگوئیوں اور گستاخیوں سے کتاب بھری ہوئی ہے۔ ایسے کلمات بیشک کفر ہیں۔... لیکن چونکہ اسمٰعیل کی نسبت یہ مشہور تھا کہ اس نے اپنے ان تمام اقوال سے توبہ کرلی تھی، اس لیے علماء محتاطین

نے اس کو کافر کہنے سے احتیاطاً زبان روکی اور اقوال کو کفر وضلال بتایا۔"

(اطیب الایمان رد تقویۃ الایمان 351)

بریلوی علما نے جن امور کو کفر وضلال اور گستاخی قرار دیا، ان کا تعلق بنیادی طور پر ان خاص عقائد و تصورات سے تھا جنھیں وہ درست سمجھتے تھے، جب کہ شاہ اسماعیل نے ان کو خلاف شرع قرار دے کر ان پر تنقید کی تھی، تاہم "تقویۃ الایمان" کے بعض جملوں کے متعلق بعض نمایاں دیوبندی اکابر نے بھی یہ تاثر ظاہر کیا ہے کہ وہ نامناسب اور بے محل تھے۔ مثال کے طور پر مولانا احمد رضا بجنوری رحمہ اللہ نے علامہ انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے:

"میں تقویۃ الایمان سے زیادہ راضی نہیں ہوں۔ غالباً ضرورت وقت کے ماتحت لکھی تھی۔ حضرت شاہ محمد اسحاق صاحب، حضرت شاہ محمد یعقوب صاحب، مومن خاں شاعر...، مولوی رشید الدین خان صاحب...، پانچواں نام احقر کو یاد نہیں رہا...، ان پانچ اشخاص کو یہ کام سپرد ہوا تھا کہ تقویۃ الایمان کے الفاظ و مضامین پر غور کریں اور بدلنے کا بھی اختیار دیا گیا تھا۔ ان میں سے تین کی ایک جماعت ہو گئی اور دو کی ایک جماعت ہو گئی۔ ایک نے کہا کہ ایسے الفاظ مناسب نہیں ہیں۔ دوسرے نے کہا کہ یہ بات سچی صاف صاف کہنی چاہیے اور بغیر تیز کلامی کے نکھار نہیں ہوتا۔ حضرت کے سامنے اس رسالہ کی محدثانہ نقطۂ نظر سے بھی خامیاں ضرور رہی ہوں گی۔ پھر حضرت نے فرمایا کہ میں اس لیے راضی نہیں ہوں کہ محض ان عبارات کی وجہ سے بہت سے جھگڑے ہو گئے ہیں۔... اور یہی بات کہ "میں راضی نہیں ہوں اس رسالہ سے" مجھے مرحوم حضرت مولانا نانوتوی رحمہ اللہ سے بھی پہنچی ہے، حالاں کہ وہ ہلاک تھے مولانا اسماعیل رحمہ اللہ کی محبت میں۔" (ملفوظات محدث کشمیری 178)

بہر حال، اعتقادی اصلاح کے لیے شاہ اسماعیل کا جوش و جذبہ، جس کا بنیادی نکتہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق فوق الفطری تصورات کی نفی کرنا تھا، ان کی توقع یا ارادے کے علی الرغم اس بات کا موجب بن گیا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت اور کائناتی مقام سے متعلق اہل تصوف کے نظریات کو ایک باقاعدہ اور واضح اعتقادی سانچے میں ڈھال دیا جائے۔ یوں حقیقت محمدیہ سے متعلق ان تصورات کو جنھیں اب تک صوفیہ کے حلقوں میں ان حقائق میں شمار کیا جاتا تھا جن تک غیر معمولی ادراکی و عرفانی صلاحیتوں کے حامل اولیا کی ہی رسائی ہو سکتی ہے، اب عوامی سطح پر

قابل اظہار متعین عقائد بننے کے عمل سے گزارا گیا۔ یوں علم تصوف کا یہ اصول کہ خواص کو حاصل سری و عرفانی علوم کو عام اور سادہ مسلمانوں کے سامنے بیان نہ کیا جائے، شاہ اسماعیل اور ان کے ہم خیال مصلحین کی اصلاحی مہم کے جواب میں بالکل پس پشت ڈال دیا گیا۔

ڈاکٹر شیر علی ترین کی زیر نظر کتاب میں مغربی قارئین کے سامنے اسی نزاع کی ایک تاریخی تفہیم پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ کتاب کی تصنیف میں ڈاکٹر ترین کے پیش نظر متعدد مقاصد ہیں۔ وہ بریلوی دیوبندی اختلاف کی اس تعبیر کی تصحیح بھی کرنا چاہتے ہیں کہ یہ شریعت اور روحانیت کا یا صوفیانہ روایت اور فقہی روایت کا اختلاف ہے۔ وہ بجا طور پر واضح کرتے ہیں کہ یہ دونوں مکتب فکر جن کی نمایندگی جنوبی ایشیا کے بلند پایہ علما کرتے ہیں، صوفیہ کی روحانی روایت کے ساتھ گہری وابستگی رکھتے ہیں اور دونوں کی اصلاحی مساعی میں تقویٰ وتزکیہ کے ان نمونوں کی ترویج بنیادی اہمیت کی حامل ہے جو تصوف میں بتائے جاتے ہیں۔ اس ضمن میں ڈاکٹر ترین نے ان اصلاحات کا بھی ذکر کیا ہے جو بریلوی علما عوامی سطح پر رائج مذہبی ثقافت میں کرنا چاہتے تھے، البتہ شاہ اسماعیل کے اصلاحی منہج کے برعکس وہ یہ کام مقرب ہستیوں اور شخصیات پر مشتمل اس تکوینی نظام کو برقرار رکھتے ہوئے کرنا چاہتے تھے جس کے بغیر تصوف بہ طور ایک ادارے کے عام لوگوں کے لیے اپنی کشش برقرار نہیں رکھ سکتا۔

مصنف کا ایک اور بنیادی مقصد یہ واضح کرنا ہے کہ مغربی سماجی علوم میں مسلمانوں کے داخلی مباحث اور مذہبی تقسیم کو سمجھنے اور ان کا تجزیہ کرنے کے مروج فریم ورک قطعاً ناکافی اور گم راہ کن ہیں۔ مصنف کا کہنا ہے کہ اسلام یا کسی بھی مذہب کے مطالعے کا لبرل سیکولر انداز فکر اپنی فکری محدودیت کی وجہ سے مسلمانوں کے داخلی مباحث کو گہرائی میں سمجھنے سے قاصر رہتا ہے۔ مثال کے طور پر دیوبندی بریلوی اختلاف کو اس قدیم کشمکش کا ایک مظہر سمجھا جاتا ہے جو اسلام میں فقہا اور صوفیہ کے مابین رہی ہے، حالاں کہ اس نزاع کے دونوں فریق فقہ حنفی اور صوفیانہ روحانیت کے مشترک علمی مآخذ اور روایات سے وابستہ ہیں۔ ڈاکٹر ترین نے کئی پہلوؤں سے مطالعۂ مذہب کے حوالے سے غالب سیکولر لبرل فریم ورک پر تنقید کی ہے اور اس کا نمایاں اظہار جنوبی ایشیا کی تاریخ پر کام کرنے والی معروف مصنفہ ڈاکٹر عائشہ جلال کے تجزیوں پر ان کی تنقید میں ہوا ہے۔

ڈاکٹر عائشہ جلال نے اپنی کتاب ”Partisans of Allah“ میں ــــ جس کا موضوع جنوبی

ایشیا میں جہاد کا تصور ہے ـــــ یہ نقطۂ نظر پیش کیا ہے کہ سید احمد شہید (وفات 1831ء) اور شاہ اسماعیل نے پنجاب میں سکھوں کے خلاف اور شمال مغربی سرحدی صوبے میں قبائلی سرداروں کے خلاف جو جہاد کیا، وہ مذہب کو ایک امتیازی شناخت سمجھنے کے ـــــ نظر پر مبنی تھا۔ مصنفہ کے خیال میں حقیقی اسلام مذہب کو ایمان اور روحانیت کے طور پر پیش کرتا ہے، جس کا تعلق داخلی احساسات و تجربات سے ہے، جب کہ مذہب کو ایک امتیازی شناخت سمجھنے کا زاویہ ظاہری رسوم عبادات کو زیادہ اہمیت دیتا اور سیاسی طاقت کے حصول اور استحکام کے لیے تشدد کے استعمال کو بنیاد مہیا کرتا ہے۔ ڈاکٹر ترین نے اس تجزیے پر یہ تنقید کی ہے کہ مذہب کو داخلی اور روحانی تجربے میں اور ظاہری رسوم واعمال کی ادائیگی میں تقسیم کرنا اور پھر مقدم الذکر کو ایک پاکیزہ عمل، جب کہ موخر الذکر کو تشدد اور سیاست سے آلودہ بتانا دراصل لبرل سیکولر زاویۂ نظر سے مذہب کو دیکھنے کا نتیجہ ہے جو اپنی فکری ترجیحات کے مطابق ایک خاص طرح کے مذہب کو قابل قبول اور اس سے متصادم مذہب کو ناقابل قبول قرار دینا چاہتا ہے۔

کتاب کے آخری حصے میں ڈاکٹر ترین نے سیکولر لبرل مفروضات میں سے اس مفروضے پر بھی کلام کیا ہے کہ مذہبی مناظرانہ بحثیں اپنی نوعیت کے لحاظ سے لازماً تشدد پر منتج ہوتی ہیں اور یوں معاشرے کے امن اور نظم وضبط کے لیے ایک خطرہ ہوتی ہیں۔ ڈاکٹر ترین بتاتے ہیں کہ انیسویں صدی میں بریلوی دیوبندی مناظرانہ بحثیں پورے جوش وخروش سے جاری رہیں، لیکن ان میں تصادم یا تشدد کا پہلو شامل نہیں تھا۔ ان کی رائے میں یہ حقیقت مذکورہ سیکولر مفروضے کی صحت کو مشتبہ بنا دیتی ہے۔ اس تناظر میں، وہ چند سال قبل حکومت پنجاب کی طرف سے کیے گئے اس اقدام کو سطحی قرار دیتے ہیں جس کی رو سے دیوبندی، بریلوی، شیعہ اور سلفی علما کی لکھی گئی درجنوں مناظرانہ کتابوں پر پابندی عائد کر دی گئی۔ مصنف کے خیال میں یہ اقدام جدید ریاست کے اس رجحان کا غماز ہے کہ وہ مذہب کے حدود متعین کرنے پر اختیار حاصل کرنا اور معاشرے میں مذہبی مباحث کو ریاستی نظام طاقت کے لحاظ سے تشکیل چاہتی ہے۔ ڈاکٹر ترین کے الفاظ میں:

> ”مذہب کو معتدل بنانے کی یہ ریاستی کوششیں، جن کا درپردہ مقصد مغرب کی سامراجی خواہشات اور تصورات کی تسکین وافزائش ہے، نتیجے کے اعتبار سے مزاحیہ زیادہ الم ناک اور پرتشدد ہیں۔ عوامی دائرے کو مذہبی اختلافات سے چھٹکارا دلانے کی تحریک اس مناظرے کی

استدلالی فضا کے متعلق ایک مخصوص تشکیکی اور مذبذب رویے سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ مفروضہ کہ مذہبی اختلاف ہمیشہ تشدد پر منتج ہوتا ہے، اس خواہش کو عملی جامہ پہناتا ہے کہ تمام اشتعال انگیز مواد (مثلاً مناظرانہ کتابوں) پر پابندی لگادی جائے، کیونکہ یہ سب کتابیں مل کر مناظرانہ آگ بھڑکا سکتی ہیں۔ تاہم اس خواہش اور حکمت عملی کی تقدیر میں ناکامی ہے۔ جیسا کہ میخائیل توسگ نے عمدگی سے استدلال کیا ہے، کسی شے کو مٹانے یا مسخ کرنے سے وہ زیادہ ابھر کر سامنے آتی ہے۔"

ڈاکٹر ترین کے بنیادی استدلال میں یقیناً وزن ہے، تاہم اس سوال پر مزید غور و فکر کی ضرورت ہے کہ جنوبی ایشیا میں آج ہمیں مذہبی شناخت پر مبنی پر تشدد رویوں کی جس صورت حال کا سامنا ہے، اس کا استعماری دور کے ان مناظرانہ مباحث سے کیا تعلق بنتا ہے جن پر زیر نظر کتاب میں گفتگو کی گئی ہے۔ اس حوالے سے راقم نے کچھ عرصہ قبل جو معروضات پیش کی تھیں، یہاں ان کا حوالہ دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ راقم نے لکھا کہ:

"پچھلے دو سو سال... میں مذہبی یا غیر مذہبی سیاسی شناخت کی تشکیل کا عمل ہمارے ہاں بنیادی طور پر مثبت اصولوں پر نہیں، بلکہ منفی اصولوں پر ہوا ہے جس میں بنیادی محنت کسی "دوسرے" کو اپنی شناخت کے لیے خطرہ قرار دینے اور پھر اس کے خلاف تن من دھن کی بازی لگا دینے کا جذبہ پیدا کرنے پر کی گئی ہے۔ تحفظ شناخت کی اس سیاست کی ابتدا استعماری دور سے پہلے اہل تشیع کی تکفیر کی صورت میں ہو چکی تھی جس میں حضرت مجدد رحمہ اللہ جیسی بلند قامت شخصیت نمایاں تھی۔ استعماری دور میں شناخت کے تحفظ کا یہی اصول بریلوی علما نے باقی تمام گروہوں اور خاص طور پر دیوبندی علما کے خلاف استعمال کیا۔ نیچریوں، قادیانیوں اور منکرین حدیث وغیرہ کے ظہور نے تمام روایتی مذہبی گروہوں کے لیے شناخت کے تحفظ کے لیے کچھ مزید "اہداف" کا اضافہ کر دیا۔ بیسویں صدی کے نصف اول میں سیاسی شناخت کے تحفظ کے لیے مسلم لیگ نے بھی بہ تدریج اسی طرز کو اختیار کیا اور مکمل کامیابی حاصل کی۔ اس کی تشکیل کردہ شناخت اپنے تمام تر لوازم کے ساتھ آج بھی پاکستان کی قومی ریاست کا اثاثہ ہے۔

استعماری دور میں مختلف مذہبی شناختوں کے لیے ایک دوسرے سے بھڑنا استعماری طاقت کی موجودگی کی وجہ سے ممکن نہیں تھا، لیکن حصول وطن کے بعد اس میں یہ رکاوٹ باقی نہیں

رہی۔ چنانچہ مختلف مراحل پر پہلے قادیانی، پھر انقلاب ایران کے پس منظر میں شیعہ، پھر سلمان رشدی کے واقعے کے تناظر میں مقامی مسیحی آبادی، پھر سیکولرزم کے نمایندے، اور آخر کار خود ریاست اور ریاستی ادارے اس کا نشانہ بنے۔ توہین مذہب کے الزام نے ایک مذہبی ہتھیار کی صورت اختیار کر لی ہے جس سے لگتا نہیں کہ کوئی طبقہ بچ پائے گا، یہاں تک کہ خود ناموس رسالت کے محافظ اس کی زد میں آ چکے ہیں۔ blasphemy hunting کا ایک ہیجان ہے جو معاشرے میں برپا کر دیا گیا ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے جیسے سلمان رشدی اور اس جیسے بدبختوں کا انتقام مذہبی جنونی خود اپنے ہی معاشرے سے لینا چاہ رہے ہیں۔...

اس سارے عمل میں ریاست بہ تدریج ایک اور مقصد بھی حاصل کرتی جا رہی ہے، یعنی مذہبی اور مذہبی اظہارات پر مکمل ریاستی کنٹرول قائم کرنے کی طرف پیش قدمی۔ مذہبی شناختیں اپنے بھولے پن کی وجہ سے بعض چیزوں میں ریاست کو "دباؤ" قبول کرتا ہوا دیکھ کر سمجھتی ہیں کہ وہ پیش قدمی کر رہی ہیں، جب کہ حقیقت میں وہ مذہب کے دائرے میں ریاست کے دخل کو جواز دینے میں نہ صرف آلۂ کار کا کردار ادا کر رہی ہیں، بلکہ خود دعوت دے کر ریاست کو مذہب میں دخیل بنا رہی ہیں۔ اس سارے کھیل کا آخری نتیجہ مذہب اور مذہبی ڈسکورس کے مکمل طور پر سیکولرائزڈ ہو جانے کی صورت میں نکلنا نوشتۂ دیوار ہے، اور یہی وہ نکتہ ہے جس کا فہم عام جذباتی مذہبی ذہن تو کیا، مذہبی لیڈرشپ کو بھی حاصل ہونا قطعی طور پر مشکوک ہے۔

جنوبی ایشیائی اسلام کو اور خاص طور پر مذہبی گروہوں کو تاریخ اور نئے سیاسی و معاشرتی حقائق کی ایک نئی اور معروضی تفہیم کی ضرورت ہے جس میں مختلف مذہبی شناختوں کی بقائے باہمی کو شعوری طور پر، نہ کہ صرف حالات کے جبر کے طور پر، قابل قبول بنایا جا سکے۔ یہ مذہب کے معاشرتی کردار کو باقی رکھنے اور اسے مکمل ریاستی کنٹرول سے بچانے کی واحد ممکن ضمانت ہے۔"

(ماہنامہ الشریعہ، ستمبر 2020ء)

ان جزوی ملاحظات کے ساتھ، زیر نظر کتاب کو جنوبی ایشیا میں اسلامی فکری روایت کے تنقیدی مطالعے کے ضمن میں ایک اہم علمی ضرورت کی تکمیل کی طرف اہم پیش رفت قرار دیا جا سکتا ہے۔ مغربی علمی دنیا پر یہ کتاب کس نوعیت کے اثرات مرتب کر سکے گی، اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے، تاہم یہ بات اعتماد کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ خود جنوبی ایشیا کے اہل علم کو ماضی قریب کی

فکری تاریخ کی تفہیم و تعبیر کے لیے یہ کتاب ایک اہم زاویہ مہیا کرتی ہے اور اس سے استفادہ کرتے ہوئے جنوبی ایشیا کی دینی فکری روایت کو زیادہ بہتر انداز میں اور زیادہ گہرائی کے ساتھ سمجھنے کے عمل کو آگے بڑھایا جاسکتا ہے۔

ہمارے فاضل اور لائق دوست مولانا محمد جان اخونزادہ نے بہت محنت اور لگن سے اس کو اردو کے قالب میں ڈھالا ہے اور راقم کو بھی اس ترجمے پر ایک عمومی نظر ثانی کا موقع ملا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ مطالعے کے دوران میں قارئین مصنف کے علم و دانش سے استفادہ کے ساتھ ساتھ فاضل مترجم کی محنت اور لیاقت کا بھی حظ اٹھائیں گے۔ میں ادارۂ فکر جدید کے سربراہ جناب صاحبزادہ امانت رسول صاحب کا بھی ممنون ہوں کہ انھوں نے اس علمی کاوش کی قدر دانی کی اور ترجمے کے کام کے دوران میں ہی اپنے ادارے کی طرف سے اس کی اشاعت میں گہری دل چسپی کا اظہار کیا۔ ترجمے اور نظر ثانی کی تکمیل میں ان کی مسلسل یاد دہانی کا بڑا حصہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو اس کا بہترین صلہ دے اور علم و عمل میں برکت سے نوازے۔ آمین

[21/مارچ2024ء]

ریحان احمد یوسفی

صبر: دنیا اور آخرت میں کامیابی کا راستہ

قرآن مجید اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب ہے۔ اس کتاب کے نزول کے ساتھ انبیا کی آمد کا سلسلہ ختم ہو گیا ہے۔ اسی بات سے یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ کتاب خدا کا پیغام پہنچانے کے معاملے میں کتنی واضح ہے کہ اب کسی نبی کی ضرورت ہی نہیں کہ وہ دین کا اصل پیغام، یعنی ایمان و اخلاق کو انسانوں تک پہنچائیں۔ یہ پیغام نہ صرف اس کتاب میں پوری شرح و وضاحت کے ساتھ بار بار دہرایا گیا ہے، بلکہ مطلوب اعمال کی قدر و قیمت بھی اس طرح واضح کی گئی ہے کہ تدبر کی نگاہ سے قرآن پڑھنے والا کوئی شخص اس قدر و قیمت سے بے خبر نہیں رہ سکتا۔

ان مطلوب اعمال و اوصاف میں سے ایک صبر کا وصف بھی ہے۔ آج اسی پر تفصیل سے گفتگو ہو گی اور اس مضمون کے مطالعے کے بعد اس طالب علم کا یہ یقین ہے کہ ان شاء اللہ صبر سے متعلق قارئین کا نقطۂ نظر بالکل بدل جائے گا۔

صبر سے متعلق غلط فہمیاں

یہ جو آخری بات کہی گئی ہے کہ صبر سے متعلق قارئین کا نقطۂ نظر بالکل بدل جائے گا، اس کی ایک وجہ ہے۔ وہ یہ کہ ہمارے ہاں عام طور پر صبر کو وہ اہمیت نہیں دی گئی جو اہمیت اسے قرآن مجید

نے دی ہے۔ صبر ہمارے ہاں عام طور پر ایک سلبی چیز سمجھا جاتا ہے جو مجبوری اور بے بسی کے عالم میں کیا جاتا ہے۔ اس کا دائرہ غم و مشکلات تک محدود کر دیا گیا ہے۔ اسے ہمارے ہاں عام طور پر کم ہمتی اور بزدلی کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ اس کے معنی اور مفہوم کے حوالے سے بھی بڑی غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں۔

ان سب وجوہات کی بنا پر صبر نہ صرف ہمارے مذہبی فکر میں اپنی اصل جگہ نہیں پا سکا، بلکہ اس کی عدم موجودگی کی بنا پر ہمارے پورے تربیتی نظام میں بڑی کم زوری پیدا ہو گئی ہے۔ ہمارے معاشرے کے بہت سے مسائل کے پیچھے یہ حقیقت کار فرما ہے کہ صبر ہماری تربیت کا حصہ نہیں ہے یا ہم صبر کے مفہوم ہی سے واقف نہیں ہیں۔ جب کہ درحقیقت صبر انسانی شخصیت کا سب سے اہم اور بنیادی وصف ہے۔ صبر نہ ہو تو کوئی شخص دنیا میں کوئی بڑا کام نہیں کر سکتا۔ قرآن مجید اسے دنیا و آخرت میں فلاح کا راستہ قرار دیتا ہے۔ آج کی اس گفتگو میں ان شاء اللہ انھی چیزوں کی تفصیلی وضاحت قرآن مجید کی روشنی میں کی جائے گی۔

صبر: فلاحِ آخرت کا راستہ

گفتگو کے آغاز میں یہ طالب علم قرآن مجید کی روشنی میں اس حقیقت کو واضح کرے گا کہ آخرت کے پہلو سے اللہ تعالیٰ صبر کو کس مقام پر رکھتے ہیں۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا طریقہ یہ ہے کہ جب وہ جنت کی فوز و فلاح کو بیان کرتے ہیں تو عام طور پر اسے کچھ متعین اعمال کی جزا کے طور پر بیان کرتے ہیں۔ دوسری شکل یہ ہوتی ہے کہ وہ پورے دین کا خلاصہ ایمان و عمل صالح کی شکل میں بیان کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ جو لوگ ایمان لائے اور عمل صالح کو اختیار کرتے ہیں، ان کو جنت میں داخل کیا جائے گا۔

تاہم قرآن مجید کے کئی مقامات پر انھوں نے تمام اعمال، عبادات، اخلاقیات اور سب سے بڑھ کر ایمانیات کو چھوڑ کر صرف صبر ہی کو جنت میں داخلے کی وجہ بتایا ہے۔ تنہا اسی بات سے اللہ تعالیٰ کے نزدیک صبر کی قدر و قیمت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ چند مقامات درج ذیل ہیں:

اِنِّیْ جَزَیْتُهُمُ الْیَوْمَ بِمَا صَبَرُوْٓا اَنَّهُمْ هُمُ الْفَآىِٕزُوْنَ. (المومنون 23:111)	”آج ان کے صبر کا میں نے ان کو صلہ دیا ہے کہ وہی کامیاب ہیں۔“

وَجَزٰهُم بِمَا صَبَرُوا جَنَّةً وَّحَرِيْرًا. (الدہر 12:76)	”اور ان کے صبر کے بدلے میں انھیں (رہنے کے لیے) باغ اور (پہننے کے لیے) ریشمی پوشاک عطا فرمائی۔“
اُولٰٓئِكَ يُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ بِمَا صَبَرُوْا وَ يُلَقَّوْنَ فِيْهَا تَحِيَّةً وَّ سَلٰمًا. خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ حَسُنَتْ مُسْتَقَرًّا وَّ مُقَامًا. (الفرقان 25:76-75)	”یہی ہیں جن کو ان کی ثابت قدمی کے صلے میں بہشت کے بالا خانے ملیں گے اور وہاں آداب و تسلیمات کے ساتھ ان کا استقبال کیا جائے گا۔“
اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ. جَنّٰتُ عَدْنٍ يَّدْخُلُوْنَهَا ... وَ الْمَلٰٓئِكَةُ يَدْخُلُوْنَ عَلَيْهِمْ مِّنْ كُلِّ بَابٍ. سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ. (الرعد 13:24-22)	”اگلے گھر کا انجام انھی کے لیے ہے۔ ابد کے باغ جن میں وہ داخل ہوں گے... فرشتے ہر دروازے سے ان کے پاس آئیں گے۔ اور کہیں گے: تم لوگوں پر سلامتی ہو، اس لیے کہ تم ثابت قدم رہے۔ سو کیا ہی خوب ہے یہ اگلے گھر کا اچھا انجام“!

ان مقامات کو پڑھیے اور بار بار پڑھیے۔ آپ پر صبر کی اہمیت واضح ہو گی کہ کس طرح جنت کی کامیابی، اس کے باغات، اس کا ریشمی لباس، اس کے بلند و بالا گھر، اس میں فرشتوں کے سلام غرض، ہر نعمت کو صبر کا بدلہ قرار دیا گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس پہلو سے قرآن مجید میں کوئی دوسرا وصف ڈھونڈنا مشکل ہے، جس کے حوالے سے اللہ تعالیٰ نے اس طرح گفتگو کی ہو۔

صبر: دنیا میں فلاح کا راستہ

معاملہ صرف آخرت ہی کا نہیں، بلکہ دنیا میں بھی فلاح و کامرانی کا دروازہ جس شاہ کلید سے کھلتا ہے، قرآن مجید اسے بھی صبر قرار دیتا ہے۔ اس حوالے سے قرآن مجید نے جن چند اہم پہلوؤں کی طرف توجہ دلائی ہے، ان کو ہم ذیل میں بیان کر رہے ہیں۔

اس ضمن کی پہلی چیز دشمن پر غلبہ اور جنگ میں کامیابی ہے۔ بہت سے لوگوں کے لیے یہ بات باعث حیرت ہو گی کہ جنگ جیسے موقع پر جہاں بہادری و جواں مردی کو کامیابی کی کنجی سمجھا جاتا

ہے۔ جنگی حکمت عملی کو فتح کا راز سمجھا جاتا ہے۔ یا پھر مذہبی پہلو سے دیکھیں تو خیال ہوتا ہے کہ ایمان کو مطلوب صفت کے طور پر پیش کیا جانا چاہیے۔ مگر ان سب کے برعکس قرآن مجید جب جنگ میں کامیابی اور دشمن پر غلبے کا راستہ بتا رہا ہے تو اس وقت سارے اوصاف چھوڑ کر صبر کا وصف بیان کیا گیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

اِنْ یَّکُنْ مِّنْکُمْ عِشْرُوْنَ صٰبِرُوْنَ یَغْلِبُوْا مِائَتَیْنِ. (الانفال 65:8)

”اگر تمھارے لوگوں میں بیس آدمی ثابت قدم ہوں گے تو دو سو پر غالب آئیں گے۔“

یہ جنگ بدر کا موقع تھا، جب صحابۂ کرام کی وہ جماعت میدان میں تھی جنھیں بلاشبہ قدسیوں کی جماعت کہا جاسکتا ہے اور جن سے بہتر لوگ انسانیت نے کبھی نہیں دیکھے۔ مگر ان کا بھی جو وصف قرآن نے بیان کیا ہے، وہ صبر ہی ہے۔ اس کے بعد مزید لوگ ایمان لائے، جن کی بنا پر مومنین کی جماعت میں ایک نوعیت کا ضعف پیدا ہو گیا۔ چنانچہ ایک اور دس کا تناسب بدل کر ایک اور دو کا کر دیا گیا۔ مگر مطلوب وصف نہیں بدلا گیا، بلکہ وہی رہا۔ یعنی دو سو کے مقابلے میں سو صبر کرنے والے ہونے چاہییں تب ان کو دشمن پر غلبہ ملے گا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

فَاِنْ یَّکُنْ مِّنْکُمْ مِّائَۃٌ صَابِرَۃٌ یَّغْلِبُوْا مِائَتَیْنِ. (الانفال 66:8)

”سو تمھارے سو ثابت قدم ہوں گے تو دو سو پر غالب آئیں گے۔“

یہی صبر ہے جس کی درخواست جالوت کے خلاف لڑنے والے ان اہل ایمان نے کی تھی، جن کی قیادت طالوت کر رہے تھے۔ حضرت داؤد نے اس جنگ میں جالوت کو قتل کیا تھا اور بادشاہ طالوت نے اپنی بیٹی کی شادی ان سے کر دی تھی۔ بعد ازاں حضرت داؤد بنی اسرائیل کے حکمران بن گئے۔ اس جنگ کے حوالے سے اہل ایمان کی جو دعا قرآن نے نقل کی، وہ درج ذیل ہے:

رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَیْنَا صَبْرًا وَّ ثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَی الْقَوْمِ الْکٰفِرِیْنَ. (البقرہ 250:2)

”اے ہمارے رب، ہم پر صبر انڈھیل دے اور ہمارے قدموں کو جما دے اور ان منکروں کے مقابلے میں ہماری مدد فرما۔“

یہ دعا صرف صبر کی دعا نہیں، بلکہ نصرت الٰہی کی ایک درخواست بھی ہے۔ قرآن نے دوسرے

مقام پر واضح کر دیا کہ نصرت الٰہی کے لیے بھی صبر ہی بنیادی وصف ہے، جو مطلوب ہے۔ اس حوالے سے جنگ احد کے موقع پر نازل ہونے والی درج ذیل آیت ملاحظہ کیجیے، جس میں فرشتوں کے نزول کو صبر پر موقوف کیا جا رہا ہے۔ یہاں اگرچہ تقویٰ کا بھی ذکر ہے اور آگے بھی صبر کے ساتھ دوسرے اوصاف بیان ہوں گے، مگر نوٹ کیجیے کہ ہر جگہ صبر کو مقدم کر کے اس کی بنیادی حیثیت کو نمایاں کر دیا گیا ہے۔ ارشاد ہے:

بَلٰٓی ۙ اِنۡ تَصۡبِرُوۡا وَ تَتَّقُوۡا وَ یَاۡتُوۡکُمۡ مِّنۡ فَوۡرِہِمۡ ہٰذَا یُمۡدِدۡکُمۡ رَبُّکُمۡ بِخَمۡسَۃِ اٰلٰفٍ مِّنَ الۡمَلٰٓئِکَۃِ مُسَوِّمِیۡنَ. (آل عمران 3:125)

”ہاں کیوں نہیں، اگر تم صبر کرو اور خدا سے ڈرتے رہو اور تمھارے دشمن اسی وقت تم پر آپڑیں تو تمھارا پروردگار پانچ ہزار فرشتوں سے تمھاری مدد کرے گا، جو خاص نشان لگائے ہوئے ہوں گے۔“

موجودہ دور میں مسلمانوں کو اکثر و بیش تر یہود و نصاریٰ، روس و امریکہ، بھارت اور اسرائیل کی سازشوں کی فکر رہتی ہے۔ قرآن نے دشمنوں کی چالوں اور سازشوں کو بھی موضوع بحث بنا کر ان سے بچنے کا نسخہ بتایا ہے۔ اس نسخے کا جز اول ایک دفعہ پھر صبر ہی ہے:

وَ اِنۡ تَصۡبِرُوۡا وَ تَتَّقُوۡا لَا یَضُرُّکُمۡ کَیۡدُہُمۡ شَیۡئًا. (آل عمران 3:120)

”اور (یاد رکھو کہ) اگر تم صبر کرو گے اور اللہ سے ڈرتے رہو گے تو اِن کی کوئی تدبیر تمھیں کچھ بھی نقصان نہ پہنچا سکے گی۔“

موجودہ دور میں مسلمان غیر مسلموں سے ہر اعتبار سے بہت کم زور ہیں۔ یہی معاملہ بنی اسرائیل کا تھا، جن کا دشمن فرعون ان سے بہت طاقت ور تھا۔ حال یہ تھا کہ وہ ان کے نومولود بچوں کو قتل کر دیا کرتا اور وہ اس بدترین ظلم کے خلاف کچھ نہیں بول سکتے تھے۔ وہ قومی طور پر فرعون اور اس کی قوم کے غلام تھے۔ مگر قرآن بتاتا ہے کہ اللہ نے حضرت موسیٰ کو ان کے درمیان مبعوث کر کے جو وعدے بھی ان کے ساتھ کیے تھے، وہ پورے کیے اور ان کے دشمن فرعون کو ہلاک کیا، مگر یہ اس وقت ہوا جب انھوں نے صبر سے کام لیا:

وَ تَمَّتۡ کَلِمَتُ رَبِّکَ الۡحُسۡنٰی عَلٰی

”بنی اسرائیل پر تیرے پروردگار کا

بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ بِمَا صَبَرُوۡا ۟ وَ دَمَّرۡنَا مَا کَانَ یَصۡنَعُ فِرۡعَوۡنُ وَ قَوۡمُہٗ وَ مَا کَانُوۡا یَعۡرِشُوۡنَ.(الاعراف 137:7)

وعدۂ خیر اس طرح پورا ہوا، کیونکہ وہ ثابت قدم رہے اور ہم نے فرعون اور اُس کی قوم کا سب کچھ برباد کر دیا، جو وہ (اپنے شہروں میں) بناتے اور جو کچھ (دیہات کے باغوں اور کھیتوں میں ٹٹیوں پر) چڑھاتے تھے۔"

ہمارے ہاں ایک اور اہم مسئلہ یہ سمجھا جاتا ہے کہ صحیح لیڈرشپ نہیں پیدا ہوتی۔ قرآن مجید نے اس مسئلے کا جو حل بنی اسرائیل کے حوالے سے بیان کیا ہے، اس میں بھی صبر کو مطلوب وصف کے طور پر بیان کیا ہے۔ بلکہ یہاں قابل ذکر بات یہ ہے کہ یقین، یعنی ایمان کا ذکر صبر کے بعد کیا ہے، مقدم یہاں بھی صبر ہی کو رکھا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَ جَعَلۡنَا مِنۡہُمۡ اَئِمَّۃً یَّہۡدُوۡنَ بِاَمۡرِنَا لَمَّا صَبَرُوۡا ؕ۟ وَ کَانُوۡا بِاٰیٰتِنَا یُوۡقِنُوۡنَ.(السجدہ 24:32)

"اور جب اُنھوں نے ثابت قدمی دکھائی اور وہ ہماری آیتوں پر یقین بھی رکھتے تھے تو اُن کے اندر ایسے پیشوا اٹھائے جو ہمارے حکم سے اُن کی رہنمائی کرتے تھے۔"

صبر سے متعلق غلط تصورات کی تصحیح

اس موقع پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید کی روشنی ہی میں صبر سے متعلق ہمارے معاشرے میں رائج تصورات کی تصحیح کر دی جائے۔ مثلاً ایک عام غلط فہمی یہ پائی جاتی ہے کہ صبر عجز و تذلل، بے بسی، مجبوری و لاچاری میں کیا جانے والا کام ہے۔ جب کہ قرآن مجید میں ہرگز ایسا نہیں۔ یہاں تو یہ اس قوت و عزم کی اساس ہے جس سے مدد چاہنے کی تلقین کی گئی ہے۔ صحابۂ کرام کو شہادت حق کے منصب پر فائز کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے جس جدوجہد کا حکم دیا، اس میں انھیں صبر سے مدد چاہنے کی تلقین کی گئی تھی:

یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا اسۡتَعِیۡنُوۡا بِالصَّبۡرِ

"ایمان والو، ثابت قدمی اور نماز سے مدد

وَالصَّلٰوةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيۡنَ. (البقره 2:153)

چاہو۔ اِس میں شبہ نہیں کہ اللہ اُن کے ساتھ ہے جو ثابت قدم رہنے والے ہوں۔“

اس آیت میں نہ صرف صبر نماز سے مقدم ہے، بلکہ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہیں۔ غور کیجیے کہ یہ نہیں کہا گیا کہ اللہ تعالیٰ نماز پڑھنے والوں کے ساتھ ہیں۔ حالاں کہ نماز کی اہمیت اور عظمت سے پورا قرآن بھرا ہوا ہے۔ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ جس وصف، یعنی صبر سے مدد مانگی جارہی ہے اور جس کے ساتھ خدا کی معیت کا وعدہ ہے، وہ عجز و بے بسی کی علامت کیسے ہو سکتا ہے؟

صبر سے متعلق ایک اور غلط فہمی یہ ہے کہ یہ غم کے موقع پر کیا جاتا ہے۔ اس حوالے سے پہلی بات یہ ہے کہ صبر کے موقع پر غم نہ کرنے کا تصور اپنی ذات میں ایک غلط تصور ہے۔ غم تو ایک فطری چیز ہے، جو محرومی اور نقصان کے ہر موقع پر انسان محسوس کرتا ہے۔ محرومی میں کسی کا غم محسوس کرنا غیر فطری نہیں، بلکہ اسے یہ تلقین کرنا غیر فطری ہے کہ وہ غم محسوس نہ کرے۔

صبر کا اصل مفہوم

صبر کے حوالے سے یہ ساری غلط فہمیاں اس بنا پر پیدا ہو رہی ہیں کہ ہم لوگ صبر کے درست تصور سے واقف ہی نہیں ہیں۔ چنانچہ ضروری ہے کہ صبر کا صحیح تصور قرآن مجید کی روشنی میں لوگوں پر واضح کیا جائے۔

صبر اصلاً ایک مذہبی وصف نہیں، بلکہ ایک انسانی وصف ہے۔ قرآن مجید نے اسے اسی طرح بیان کیا ہے۔ ایک موقع پر جب کفار کے سرداروں نے حضور کی دعوت حق کی نفی کی تو اس موقع پر انھوں نے اپنے بتوں سے وابستہ رہنے، ان کی عبادت پر جمے رہنے اور ان کی حقانیت پر مطمئن ہونے کے لیے یہی 'صبر' کا لفظ بولا، جسے قرآن نے نقل کر دیا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَ انۡطَلَقَ الۡمَلَاُ مِنۡهُمۡ اَنِ امۡشُوۡا وَ اصۡبِرُوۡا عَلٰۤی اٰلِهَتِكُمۡ ۚۖ اِنَّ هٰذَا لَشَیۡءٌ یُّرَادُ. (ص 38:6)

”ان کے سردار اٹھ کھڑے ہوئے کہ چلو اور اپنے معبودوں پر جمے رہو۔ یہی چیز مطلوب ہے۔“

اس آیت میں بالکل واضح ہے کہ صبر ایک انسانی وصف ہے۔ یہ لفظی طور پر رکے رہنے اور روکنے کے معنی میں آتا ہے۔ آگے بڑھ کر یہی اپنے موقف، نظریے، عمل، رویے اور سوچ پر رکے رہنے اور اپنے آپ کو اس پر روکے رکھنے کے مفہوم میں استعمال ہوتا ہے۔ یعنی یہ ایک اصولی فیصلہ ہے راہ راست پر رہنے کا اور پھر اس سے نہ ہٹنے کا۔

اس کا ایک پہلو وہ ہے جس کا تعلق انسان کے ذہن و فکر سے ہے، یعنی انسان کسی نقطۂ نظر کو درست سمجھے اور پھر ہر طرح کے حالات پر اس نقطۂ نظر پر قائم رہے۔ اس کا دوسرا پہلو وہ ہے جس کا تعلق انسان کے عملی رویے سے ہے، یعنی اس نقطۂ نظر پر ثابت قدم رہنے میں جو کچھ اچھے برے حالات پیش آئیں، ان میں انسان اس نقطۂ نظر سے جنم لینے والے عملی تقاضوں کو نبھانے میں کوئی کوتاہی نہ برتے۔

دین میں صبر کا مفہوم

دین میں صبر کا یہی مفہوم ہے۔ البتہ جس موقف پر ثابت قدم رہنے کے لیے کہا گیا ہے، وہ صرف حق ہے۔ حق وہ چیز ہے جسے اللہ تعالیٰ نے ماننے یا کرنے کے لیے کہا ہو۔ اس بات کو سورۂ عصر میں بیان کردہ دینی مطالبات کی رو سے سمجھا جا سکتا ہے:

وَ الْعَصْرِ. اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ۙ. اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ تَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۙ۬ وَ تَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ. (العصر 103:3-1)

”زمانہ گواہی دیتا ہے، یہ انسان خسارے میں پڑ کر رہیں گے۔ ہاں، مگر وہ نہیں جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کیے، اور ایک دوسرے کو حق کی نصیحت کی اور حق پر ثابت قدمی کی نصیحت کی۔“

دیکھ لیجیے کہ یہاں اصل مطالبہ ایمان اور عمل صالح ہے، جو خدا کی طرف سے پیش کردہ دو بنیادی نظری اور عملی مطالبات ہیں۔ پھر انھی کو سمیٹ کر ایک لفظ ’حق‘ سے آگے بیان کر دیا کہ ایمان و عمل صالح کے جس حق کو اہل ایمان خود اختیار کرتے ہیں، اسی کی دوسروں کو تلقین کرتے ہیں اور جب دیکھتے ہیں کہ کسی کے قدم اس حق سے ڈگمگا رہے ہیں تو اسے اس حق پر ثابت قدمی یا صبر کی تلقین کرتے ہیں۔

صبر کے مواقع

قرآن مجید نے بالاجمال صبر کا ذکر کرنے کے ساتھ ان مواقع کی خاص طور پر نشان دہی بھی کی ہے جہاں انسان کے قدم ڈگمگا جاتے ہیں اور جہاں صبر کے بغیر انسان درست رویے پر قائم نہیں رہ سکتا۔ ذیل میں ہم ان کو ایک ایک کر کے بیان کریں گے۔

مصائب پر صبر

مصائب زندگی کا ایک لازمی حصہ ہیں۔ خدا نے یہ دنیا امتحان کی جس اسکیم کے تحت بنائی ہے، اس میں انسان زیادہ تر نعمتوں میں جیتا ہے، لیکن وقفے وقفے سے انسان محرومی اور مشکلات کے تجربے سے گزرتا ہے، جن کی اپنی حکمتیں ہیں۔ لیکن ان نامساعد حالات میں انسان صبر سے کام نہ لے تو پھر وہ مایوس ہو جاتا ہے۔ انسان کا عقیدہ اور عمل، دونوں خرابی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ غیر اللہ کے در سے لو لگانا، خدا سے مایوس ہو کر اس کے وجود سے انکار کر دینا، حالات کی سختیوں سے حرام میں مبتلا ہو جانا، سخت حالات میں جزع فزع کرنا اور کلمات کفر کو زبان سے نکالنا وہ چیزیں ہیں جو صبر نہ ہونے کی بنا پر ظاہر ہوتی ہیں۔ چنانچہ اہل ایمان کو ایسے تمام حالات میں صبر، یعنی درست رویے پر قائم رہنے کی تلقین کی گئی ہے۔ ارشاد ہے:

وَ لَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَیْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَ الْجُوْعِ وَ نَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَ الْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ؕ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِیْنَ. (البقرہ 2:155)

”ہم (اس راہ میں) یقیناً تمھیں کچھ خوف، کچھ بھوک اور کچھ جان و مال اور کچھ پھلوں کے نقصان سے آزمائیں گے۔ اور (اِس میں) جو لوگ ثابت قدم ہوں گے، (اے پیغمبر)، انھیں (دنیا اور آخرت، دونوں میں کامیابی کی) بشارت دو۔“

قرآن مجید نے ان مواقع پر صبر کی تلقین کر کے یہ خوش خبری دی ہے کہ اس صبر کا بدلہ خدا کی رحمت و برکت اور اس کی طرف سے ملنے والی خصوصی ہدایت ہے۔ اس کی تفصیل ہمیں حضرت ایوب علیہ السلام کی زندگی میں ملتی ہے۔ آپ نے ہر طرح کے مصائب پر جب صبر کیا تو

آپ کو تمام نعمتیں بہتر کر کے لوٹا دی گئیں۔

نیکی و دعوت کی راہ پر صبر

نیکی کی راہ اپنی ذات میں ایک مشکل راہ ہے۔ اس سے آگے بڑھ کر انسان دوسروں کو نیکی کی طرف بلانا شروع کر دے تو یہ مزید ہمت طلب کام ہے۔ انسان یہ کام کر بھی لے تو وہ توقع کرتا ہے کہ دوسرے اس کی حوصلہ افزائی کریں گے۔ اس کی دردمندی کو محسوس کریں گے، مگر اس راہ کا معاملہ یہ ہے کہ یہ کانٹوں بھری راہ ہے۔ تعریف تو درکنار یہاں اکثر تنقید سننے کو ملتی ہے۔

لیکن مومن اگر سچا مومن ہے تو اسے اس راہ میں گالیاں کھا کر بھی بے مزہ نہیں ہونا چاہیے، کیونکہ یہ انبیا کا راستہ ہے۔ حضرت لقمان نے اپنے بیٹے کو اسی بات کی نصیحت کی تھی:

وَاصۡبِرۡ عَلٰی مَآ اَصَابَکَ. (لقمان 17:31)

”اور (اِس راہ میں) جو مصیبت تمھیں پہنچے، اُس پر صبر کرو۔“

قرآن میں جگہ جگہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کفار کی بدکلامی، ظلم و زیادتی اور ان کے منفی رویے پر صبر کی تلقین کی گئی ہے۔ ایک مقام درج ذیل ہے:

وَاصۡبِرۡ عَلَی مَا يَقُوۡلُوۡنَ وَاهۡجُرۡهُمۡ هَجۡراً جَمِيۡلاً. (المزمل 10:73)

”یہ جو کچھ کہتے ہیں، اُس پر صبر کرو، اِن سے نہایت بھلے طریقے سے صرف نظر کرو۔“

برائی کے جواب میں صبر

صبر کا ایک اور اہم موقع دوسروں کی برائی کے جواب میں اچھا رویہ اختیار کرنا ہے۔ دین میں اگرچہ بدلہ لینے کا حق ہے، مگر عزیمت کا راستہ یہی ہے کہ دوسروں کی زیادتی کے جواب میں انھیں معاف کر دیا جائے:

وَلَمَنۡ صَبَرَ وَغَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنۡ عَزۡمِ الۡاُمُوۡرِ. (الشوریٰ 43:42)

”البتہ جو صبر کریں اور معاف کر دیں تو بے شک، یہی کام ہیں جن کی تاکید کی گئی ہے۔“

برائی کا جواب بھلائی سے دینے کا یہی وہ رویہ ہے جس کو بڑے نصیب والوں کا مقام قرار دیا گیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَلَا تَسْتَوِیْ الْحَسَنَةُ وَلَا السَّیِّئَةُ ادْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ أَحْسَنُ فَإِذَا الَّذِیْ بَیْنَكَ وَبَیْنَهُ عَدَاوَةٌ كَأَنَّهُ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ. وَمَا یُلَقَّاهَا إِلَّا الَّذِیْنَ صَبَرُوْا وَمَا یُلَقَّاهَا إِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِیْمٍ.
(حٰم السجدہ 41:35-34)

”حقیقت یہ ہے کہ بھلائی اور برائی، دونوں یکساں نہیں ہیں۔ تم برائی کے جواب میں وہ کرو جو اُس سے بہتر ہے تو دیکھو گے کہ وہی جس کے اور تمھارے درمیان عداوت ہے، وہ گویا ایک سرگرم دوست بن گیا ہے۔ اور (یاد رکھو کہ) یہ دانش انھی کو ملتی ہے جو ثابت قدم رہنے والے ہوں اور یہ حکمت اُنھی کو عطا کی جاتی ہے جن کے بڑے نصیب ہیں۔“

حالت نعمت میں راہ راست پر رہنے کے لیے صبر

ایک آخری مقام اس حوالے سے وہ ہے جس میں اللہ تعالیٰ یہ بات بیان کرتے ہیں کہ نعمتوں کی حالت میں درست رویہ اختیار کرنے کے لیے بھی ضروری ہے کہ انسان صبر کرے۔ یہ وہ چیز ہے جو عام حالات میں سوچی نہیں جاسکتی کہ اللہ تعالیٰ نعمتوں میں بھی صبر کی تلقین کریں گے۔ مگر صبر کا اصل مفہوم اگر واضح رہے تو یہ بات سمجھی جاسکتی ہے کہ حق پر ثابت قدمی صرف برے حالات میں نہیں، بلکہ اچھے حالات میں بھی مطلوب ہوتی ہے۔ چنانچہ جس طرح یہ ضروری ہے کہ انسان نامساعد حالات میں مایوسی اور ناشکرے پن سے بچے، اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ حالات اچھے ہوں تو انسان شیخی خورے پن اور اترانے سے باز رہے۔ اس بات کو سورۂ ہود میں یوں بیان کیا گیا ہے:

وَلَئِنْ اَذَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً ثُمَّ نَزَعْنٰهَا مِنْهُ ۚ اِنَّهٗ لَیَئُوْسٌ كَفُوْرٌ. وَ لَئِنْ اَذَقْنٰهُ نَعْمَآءَ بَعْدَ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُ

”انسان کا معاملہ یہ ہے کہ ہم اُس کو اگر اپنے کسی فضل سے نوازیں، پھر اُس سے اُسے محروم کر دیں تو لازماً شکایت کرے

لَيَقُوْلَنَّ ذَهَبَ السَّيِّاٰتُ عَنِّيْ ؕ اِنَّهٗ لَفَرِحٌ فَخُوْرٌ. اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّ اَجْرٌ كَبِيْرٌ.(ہود 11:11-9)

گا، اِس لیے کہ وہ جلد مایوس ہو جانے والا اور نہایت ناشکرا ہے۔ اور اگر کسی تکلیف کے بعد جو اُس کو پہنچی ہو، ہم اسے نعمت کا مزہ چکھائیں تو ضرور کہے گا کہ میری سب مصیبتیں مجھ سے دور ہوئیں (اور پھولا نہیں سمائے گا)، اس لیے کہ وہ بڑا اترانے والا اور شیخی بگھارنے والا ہے۔ اس سے وہی مستثنیٰ ہیں جو صبر کرتے اور اچھے عمل کرتے ہیں۔ انھی کے لیے مغفرت بھی ہے اور بڑا اجر بھی۔“

خلاصۂ گفتگو

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ صبر اچھے برے، ہر طرح کے حالات میں حق پر قائم رہنے کا نام ہے۔ زندگی کے سرد و گرم میں حق کے بارے میں نہ انسان کا نظریہ بدلے نہ اس کا رویہ بدلے۔ حق پر یہ ثابت قدمی جس طرح مصائب میں مطلوب ہے، اسی طرح لوگوں کے برے رویے، دعوت حق اور نعمت کے حال میں بھی مطلوب ہے۔ جو لوگ اس حق پر اس طرح ثابت قدم رہتے ہیں، انھیں دنیا میں غلبہ و تحفظ ملتا ہے، وہ نصرت الٰہی کے حق دار ہوتے ہیں، انھیں دشمنوں کی سازشوں سے بچایا جاتا ہے اور طاقت ور دشمنوں کے مقابلے میں بھی ان کو فتح یاب کیا جاتا ہے، جب کہ آخرت میں یہی وہ لوگ ہیں جو جنت کی ابدی کامیابی اور اس کی نعمتیں حاصل کریں گے۔

اگر ہم نے انفرادی طور پر آخرت کی فلاح حاصل کرنی ہے اور اجتماعی طور پر دنیا میں اپنا غلبہ قائم کرنا ہے تو ہمیں صبر کی بنیاد پر اپنی قوم کی تربیت کی اشد ضرورت ہے۔ اس ادنیٰ طالب علم کی یہ تحریر اس سلسلے کی پہلی کڑی ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ فکری اور عملی تربیت کے اس سلسلے کو عام کر دے۔ آمین۔

جہاں رہیں اللہ کے بندوں کے لیے باعث رحمت بن کر رہیں، باعث آزار نہ بنیں۔

کیا ہی اچھا ہے نیاگانِ کہن کا ذکرِ خیر
اُن سے لے سکتے اگر کچھ سیرت و کردار بھی

نعیم احمد بلوچ

حیاتِ امین

(سوانح مولانا امین احسن اصلاحی)

(10)

[صاحب ''تدبر قرآن'' کی وصیت کے مطابق
ان کے سوانح نگار نعیم احمد بلوچ کے قلم سے]

ماہنامہ ''الاصلاح'' اگرچہ عام ڈگر سے ہٹ کر بالکل علمی جریدہ تھا اور یہ عوام الناس کے ہاں کوئی زیادہ مقبولیت حاصل نہ کر سکا۔ اس لیے بعض احباب نے مولانا اصلاحی کو مشورہ دیا کہ وہ عام دل چسپی کی حامل تحریریں بھی اس میں شامل کریں، لیکن انھوں نے رسالے کے مقاصد پر کوئی تصفیہ نہ کیا۔ ایسے ہی کسی مطالبے کا ذکر انھوں نے ایک شذرے میں کیا اور اس کا جواب یہ دیا:

> ''عام طور پر لوگ ''الاصلاح'' کی اہمیت اور مذہبیت سے شاکی ہیں اور ناولوں اور افسانوں کی چاشنی ڈھونڈتے ہیں اور چونکہ یہ چیزیں اس میں نہیں پاتے، اس لیے اس میں اپنا روپیہ ضائع نہیں کرنا چاہتے۔ اگر عام خواہش کی پیروی کی جائے تو ممکن ہے کہ اس کا حلقۂ اشاعت کچھ وسیع ہو جائے، لیکن یہ بات کسی طرح ہماری سمجھ میں نہیں آتی۔ ہم اس کے نتائج سے بے خبر نہیں ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ کی مدد پر بھروسا ہے۔'' (مئی 1937ء)

البتہ عوامی سطح کے بجائے اس وقت کے علمی حلقوں میں جریدے کی بہت وقعت اور پذیرائی

تھی۔ اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ اس میں امام حمید الدین فراہی کی تحریر شدہ تمام اردو تحریریں شائع ہوئیں۔ پھر ان کی تفسیر ''نظام القرآن'' کا اردو ترجمہ مولانا اصلاحی کے قلم سے شائع ہوتا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ معاصر علمی شخصیات کے مضامین بھی شائع ہوتے۔ ان شخصیات کی علمی رائے سے اگرچہ مدیر کو اختلاف ہوتا، لیکن اگر بھیجی گئی تحریر میں زیر بحث مضمون کے مشمولات معیار پر پورا اترتے تو اسے شامل اشاعت کیا جاتا۔ مثلاً غلام احمد پرویز اور اسلم جیراج پوری کے مضامین بھی شائع ہوئے۔ بعض مستشرقین کی تحریروں کو بھی شامل اشاعت کیا گیا۔ پیش نظر یہ رہا کہ ہر وہ تحریر قابل اشاعت ہے، جو تقلیدی ذہن سے ہٹ کر خالص قرآن و سنت کو بنیاد بنا کر لکھی گئی ہے اور اس میں کوئی قابل توجہ علمی نکتہ پیش کیا گیا ہے۔

جریدے کی اس آزاد پالیسی کو دیکھتے ہوئے ایسی نگارشات بھی اشاعت کے لیے بھیج دی جاتیں، جو کسی طور پر بھی علمی معیار پر نہ ہوتیں۔ اسی طرح ایسی کتب بھی تبصرے کے لیے پیش کی جاتیں، جن کی کوئی علمی بنیاد نہ ہوتی۔ آزادیِ فکر کے نام سے ایسی نام نہاد علمی کاوشوں کو مولانا آڑے ہاتھوں لیتے۔ ہم یہاں مثال کے طور پر ایک تفسیر پر مولانا کا تبصرہ درج کرتے ہیں۔

خواجہ احمد الدین امرتسری نے ''بیان للناس'' کے نام سے چار جلدوں میں ایک عربی تفسیر لکھی۔ یہ صاحب اس وقت کے معروف مصنف اسلم جیراج پوری اور مشہور شاعر صوفی غلام مصطفیٰ تبسم کے استاد تھے۔ صرف قرآن ہی کو ماخذ اسلام سمجھتے اور سنت و حدیث کو اسلام کا ماخذ ماننے سے انکاری تھے۔ ان کی تفسیر پر مولانا اصلاحی نے بہ طور مدیر ''الاصلاح'' یہ تبصرہ کیا:

''باقی رہی خواجہ صاحب (احمد الدین امرتسری) کی تفسیر (بیان للناس) تو اس کے متعلق ایک بزرگ کی بیان کی ہوئی ایک حکایت بار بار یاد آتی ہے اور آج با دل نخواستہ ہم اپنے ان دوستوں کو بھی سنا دینا چاہتے ہیں۔

ایک بزرگ کسی باورچی کی دکان سے کھانا کھایا کرتے تھے۔ باورچی بد سلیقہ اور پھوہڑ تھا۔ روزانہ سالن میں دو چار مری ہوئی مکھیاں نکلتیں۔ وہ بیچارے خفا ہوتے اور سالن واپس کر دیتے۔ آئے روز کا یہی قصہ تھا۔ ایک دن انھوں نے دیکھا کہ سالن کا پورا پیالہ مری ہوئی مکھیوں سے بھرا ہوا ہے۔ انھوں نے صبر و شکر کر کے رکھ لیا۔ باورچی نے عرض کی، حضور جب سالن میں دو چار مکھیاں ہوتیں تب تو آپ خفا ہو جاتے اور پیالہ واپس کر دیتے اور آج کہ پورا پیالہ مکھیوں

سے بھرا ہوا ہے، آپ کچھ نہیں بولے۔ آخر کیا بات ہے؟ فرمایا: جب دو چار مکھیاں ہوتی تھیں، اس توقع پر خفا ہوتا تھا کہ ممکن ہے تم کو کچھ دھیان ہو اور احتیاط کرو، لیکن اب جب کہ تم مکھیوں ہی کا قورمہ پکالائے ہو تو تم سے کیا توقع اور کیا شکایت!

ہمارے محترم عرشی صاحب اور شفیع صاحب یقین کریں کہ بعینہٖ یہی صورت حال ہم کو پیش آئی۔ دو چار غلطیاں ہوں تو اس پر ٹوکیے اور اعتراض کیجیے۔ نہ تو غلطیوں کا ہونا مُستَبعد اور نہ اعتراض و نکتہ چینی کوئی گناہ، لیکن کوئی شخص غلطیوں ہی کو کیش و مشرب قرار دے لے تو اس سے کیا لڑیے، پس خواجہ صاحب کی تفسیر معتبر نہیں ہے۔ یہ ''مکھیوں کا قورمہ'' ہے، جو پڑھے لکھے کے پاس پہنچ گئی ہے، وہ سر پکڑ کے بیٹھ گیا ہے اور دعا کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ خواجہ صاحب کو معاف فرمائے اور آپ لوگوں کو توفیق دے کہ تفسیر نگاری کا مشغلہ چھوڑ کر کوئی اور دھندہ اختیار کریں۔'' (ماہنامہ الاصلاح، فروری 1938ء)

''الاصلاح'' کی اشاعت کے دوران میں بعض نام ور علمی اور ادبی شخصیات کا انتقال ہوا تو جریدے میں ان پر شان دار مقالات شائع ہوئے۔ ان شخصیات میں علامہ محمد اقبال اور مولانا شوکت علی سب سے نمایاں ہیں۔ علامہ اقبال پر ان کی لکھی گئی پوری تحریر انتہائی شان دار ہے، لیکن ہم اس کا اختتامی پیرا گراف یہاں نقل کر رہے ہیں:

''جب مایوسیاں گھیر لیتی تھیں، ہم اقبال کے شعروں میں ایک نشانیِ امید دیکھتے تھے، جب تاریکیاں چھا جاتی تھیں، اقبال ہمارے لیے شعاعِ ہدایت بن کر چمکتے تھے۔ وہ روحوں کو گرما دیتے تھے، دلوں کو تڑپا دیتے تھے۔ ان کی زبان سے ہم مشرق کے ضمیر کی صدائیں سنتے تھے۔ ان کے ہندی نغموں میں حجاز کی لے مضطرب تھی۔ وہ زمین کے تھے، مگر ان کی پرواز آسمان تک تھی۔ وہ شاعر تھے، مگر ان کی شاعری میں علم نبوت کی روح کار فرما تھی۔ وہ دنیاداروں کے بھیس میں قلندر اور دیوانوں کے رنگ میں دانائے راز تھے۔ خداوند! ہمارا یہ شاعر کہاں گیا! اس کی روح پر تیری بے پایاں رحمتیں اور برکتیں نازل ہوں۔'' (مئی 1938ء)

ایک غلط فہمی کا ازالہ

عام طور پر یہی سمجھا جاتا ہے کہ مولانا اصلاحی نے 1936ء میں دائرۂ حمیدیہ کے تحت ماہنامہ

''الاصلاح'' کا اجرا کیا اور نومبر 1938ء تک یہ جاری رہا، لیکن یہ ادھوری بات ہے۔ مکمل بات یہ ہے کہ انھوں نے سوا برس کے وقفے کے بعد اس کی دوبارہ اشاعت کا بیڑا اٹھایا۔ لیکن اب یہ ماہنامہ نہیں تھا، بلکہ ''سہ ماہی'' تھا۔ اس کا نام بھی ''الاصلاح'' سے بدل کر ''اصلاح'' رکھ دیا گیا۔ اس کے پہلے شمارے کے شذرے میں مولانا لکھتے ہیں:

''پورے سوا سال کے وقفے کے بعد مرحوم ''الاصلاح'' کی جگہ یہ سہ ماہی (مجلہ) مدرسہ کے ہم دردوں اور دائرۂ حمیدیہ کے خیر خواہوں اور ''الاصلاح'' مرحوم کے قدر دانوں کی خدمت میں حاضر ہو رہا ہے۔ یہ ''الاصلاح'' کے بجاے صرف ''اصلاح'' ہے، یعنی ''الاصلاح'' پر علمیت اور عربیت کا جو بوجھ لدا ہوا تھا، (اس پرچے میں) اتار دیا گیا ہے۔ ''الاصلاح'' ملک کے تعلیم یافتہ طبقے کے لیے نکالا گیا تھا۔ اس لیے انھی کے مذاق اور دل چسپی کی چیزیں ہوتی تھیں۔ یہ رسالہ عوام الناس کی خدمت کے لیے ہے۔ اس لیے اس میں کوئی چیز ایسی نہ ہو گی، جو کم استعداد دماغوں کے لیے بوجھ ہو۔ سیدھی سادھی باتیں ہوں گی، جن کو ہر شخص پڑھ سکے گا۔ پڑھ کر سمجھ سکے گا اور اگر چاہے گا تو ان سے فائدہ اٹھائے گا۔''

اس سہ ماہی جریدے کی اشاعت سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا اس وقت کے ہنگامی حالات میں مسلمانوں کی علمی رہنمائی کے ساتھ ساتھ کچھ عملی تجاویز بھی رکھتے تھے۔ اس کا اظہار انھوں نے ''اصلاح'' کے پہلے شمارے میں ان الفاظ میں کیا:

''ہمارا مقصد مسلمانوں کے اندر ایک ایسا انقلاب پیدا کرنا ہے جس کا نتیجہ یہ ہو کہ قرآنِ مجید ان کے تمام فکر و عمل کا مرکز قرار پائے۔ ہم پورے یقین کے ساتھ سمجھ نہیں، بلکہ دیکھ رہے ہیں کہ اس وقت ذہنی اور فکری جنگ جاری ہے، اس جنگ میں مسلمان اپنے آپ کو کم زور پا رہے ہیں اور اس کم زوری کی وجہ یہ ہے کہ وہ اس ہتھیار (قرآن مجید) سے یہ لڑائی نہیں لڑ رہے ہیں، جو اللہ تعالیٰ نے ان کو عنایت فرمایا تھا اور جو اس جنگ کے جیتنے کا واحد ہتھیار ہے اور اگر کوئی خدا کا بندہ اس کو ہاتھ میں لینے کی جرأت بھی کرتا ہے تو ایک عرصے کی غفلت اور دوری کے بعد مسلمان اس کے استعمال سے ایسے ناآشنا ہو چکے ہیں کہ بجاے اس کے کہ اس سے دشمن کو کچھ نقصان پہنچائیں، اپنی ہی تباہی میں کچھ اضافہ کر لیتے ہیں اور اس طرح ان لوگوں کا تمسّک بالکتاب دوسروں کے ترکِ کتاب سے بھی کچھ زیادہ مضر ہو جاتا ہے۔ پس ہمارے پیشِ نظر

یہ مقصد ہے کہ مسلمان قرآنِ کریم کی صحیح قدر و قیمت سے واقف ہو جائیں اور اس کو اپنی فکری اور عملی زندگی کے تمام شعبوں میں اس طرح استعمال کرنے لگیں، جس طرح ایک ماہر کارواں ایک آزمائے ہوئے ہتھیار کو استعمال کرتا ہے۔ اس ارادے کو عمل میں لانے کے لیے ایک خاص اسکیم ہے، جس کے چند اجزا اس وقت بروئے کار آچکے ہیں۔

1۔ سب سے پہلے مدرستہ الاصلاح ہے...

2۔ دوسری طرف دائرۂ حمیدیہ ہے۔ اس کے اہتمام میں قرآنی اور اسلامی علوم کے متعلق عربی اور اردو میں کتابیں شائع ہو رہی ہیں۔

3۔ تیسری طرف اس رسالے کے ذریعے سے ہم عام مسلمانوں کو بھی ان چیزوں کے قریب لانا چاہتے ہیں۔

مدرسہ اور دائرۂ حمیدیہ، دونوں کی جدوجہد کا تعلق صحیح اسلامی ذہن پیدا کرنے سے ہے۔ اور اس طرح ان کا تعلق عام مسلمانوں سے بالواسطہ ہے۔ (اب) یہ رسالہ براہِ راست عام مسلمانوں کو مخاطب کرے گا اور ان ہی کی بولی میں ان کے سامنے ان کی زندگی کی اصل ضرورتیں اور ذمے داریاں بتائے گا۔''

''اصلاح'' کی اشاعت کے خاتمے کا اعلان

1941ء کے اختتام پر ''اصلاح'' کا آخری پرچہ شائع ہوا۔ اس کے شذرے میں مولانا لکھتے ہیں:

''رسالہ ''اصلاح'' چند خاص مقاصد کو سامنے رکھ کر نکالا گیا تھا۔ ان مقاصد کی ہماری نگاہ میں اتنی اہمیت تھی کہ ہم اس کو مالی نقصان اٹھا کر بھی قائم رکھنا چاہتے تھے، لیکن گذشتہ چند ماہ میں کاغذ کی قیمت میں اتنا اضافہ ہو گیا ہے اور ہوتا جا رہا ہے کہ اب مدرسے کے لیے اس بار کا تحمل، بالخصوص موجودہ حالات میں بہت مشکل نظر آ رہا ہے (واضح رہے کہ یہ جنگ عظیم دوم کا زمانہ ہے اور پوری دنیا اس جنگ کے اثرات اپنے اوپر محسوس کر رہی تھی۔) اور اگر یہ مشکل کسی طرح حل بھی ہو جائے تو کاغذ کی کم یابی، بلکہ نایابی کی شکل کا کوئی حل سمجھ میں نہیں آتا۔ خود اس پرچے کے لیے کاغذ بہت دشواری سے حاصل کیا جا سکا ہے۔ اندریں حالات ہم نہیں کہہ

سکتے کہ ''اصلاح'' کا آیندہ پرچہ شائع ہو گا کہ نہیں۔ بہر حال جہاں تک ہمارے بس میں ہے، ہم کاغذ کی فراہمی کے لیے حتی الوسع پوری کوشش کریں گے اور اگر اس میں کامیابی حاصل ہوئی تو آیندہ پرچہ وقت پر شائع ہو گا، ورنہ ناظرین ہمیں مجبور خیال کریں اور آیندہ پرچے کا انتظار نہ فرمائیں۔ ہم جانتے ہیں کہ جن لوگوں کا ''اصلاح کے ساتھ تعلق ہے، ان کے لیے یہ اطلاع رنجیدہ ثابت ہو گی۔ لیکن کیا کیا جائے، جب حالات بالکل قابو سے باہر ہو جائیں تو ہم کیا کر سکتے ہیں؟ ہم ناظرین کو یہ یقین دلاتے ہیں کہ اگر خدانخواستہ حالات سے مجبور ہو کر ''اصلاح'' کے بند کیے جانے کا فیصلہ کرنا پڑا تو یہ فیصلہ اسی وقت تک باقی رہے گا جب تک مجبور کن حالات موجود ہیں۔ جس وقت بھی حالات میں تبدیلی یا تخفیف نمودار ہو گئی، ان شاءاللہ پرچہ دوبارہ جاری کر دیا جائے گا۔''

مولانا نے جس خدشے کا اظہار کیا تھا، وہی ہوا اور اگلے پرچے کی اشاعت کی نوبت نہ آئی۔ اور یوں یہ سلسلہ بھی ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا۔ نہ صرف ''اصلاح'' کی اشاعت بند ہوئی، اس کے ساتھ مولانا کی زندگی میں ایک اہم موڑ بھی آ گیا۔ یہ موڑ تھا مدرسۃ الاصلاح سے رخصتی اور جماعت اسلامی میں شمولیت کا۔ مولانا کے اس فیصلے کو ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی نے ایک دوسرا رنگ دیا ہے، جو حقیقت کے بالکل خلاف ہے۔ وہ مولانا اصلاحی کے اس فیصلے پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مولانا اصلاحی کی زندگی میں صحافت کے بعد سیاست در آئی۔ اس کا عکس ''الاصلاح'' کے صفحات میں بھی نظر آتا ہے۔ مولانا فراہی زندہ ہوتے تو فطری میلان کے باوجود انھیں کسی اور طرف جانے سے روکتے۔ سنۃ اللہ فی الارض کی طرح حالات و واقعات کی اپنی ایک کار فرمائی ہوتی ہے۔ مولانا مودودی سرائے میر آئے۔ مولانا اصلاحی جماعت اسلامی کے ابتدائی اجتماع میں شریک ہوئے۔ پھر وہ جماعت اسلامی میں شامل ہو گئے۔ کچھ دنوں بعد استاد کی امانتوں کو چھوڑ کر بچوں سمیت پٹھان کوٹ سدھارے۔ ان کی پہلی بیوی کا بہت پہلے انتقال ہو چکا تھا۔ مولانا مودودی نے پٹھان کوٹ کے ایک رئیس خاندان میں ان کی دوسری شادی کرا دی۔ برصغیر کی تقسیم کا واقعہ پیش آیا تو وہ پٹھان کوٹ میں تھے۔ مولانا مودودی کی امارت میں قائم جماعت کے ساتھ وہ بھی پاکستان منتقل ہو گئے، جس کے بعد وہ اپنے ماضی سے اور بھی دور ہو

گئے۔ اور پیچھے چھوڑی ہوئی یاد گاروں سے اس طرح کٹ گئے کہ ان سے دوبارہ ملنے کا کوئی امکان باقی نہیں رہا۔" (ذکر فراہی 515)

ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی کا یہ بیان متعدد غلط فہمیوں اور ادھوری معلومات کی وجہ سے بہت گم راہ کن ہے۔

[باقی]

خیال و خامہ

جاوید احمد غامدی

کونپل

چنار و سرو و صنوبر کھڑے تو ہیں، لیکن
مری نگاہ میں کونپل کی نازک اندامی
ہوا، یہ طفل، یہ بادل، یہ نخل، یہ صرصر
نہیں ہے باغ میں کوئی غریب کا حامی

میں روز و شب کے تسلسل میں دیکھ سکتا ہوں
مثالِ کاہ تھی کونپل، شباب پر آئی
فلک مقام درختوں کے درمیاں ابھری
حریفِ صرصر و باراں، وجودِ رعنائی

یہ برگِ نرم سے نخلِ بلند کی صورت
کسی کے حسنِ تخیل کی دیر پیوندی

ذرا نگاہِ تدبر سے دیکھیے اِس کو
کہاں سے پائی ہے ذرے نے شانِ الوندی!

ورق ورق سے نمایاں ہیں قدرتیں کس کی؟
نفس نفس میں فروزاں ہیں رحمتیں کس کی؟

اِسی فقیر کا یہ حلقۂ سخن ہے جہاں
عجب نہیں کہ ہوں فطرت کے رازداں پیدا

گفتگو: محمد حسن الیاس
سوالات: نجم سحر وردی
تدوین و ترتیب: رانا معظم صفدر

پاکستان، امریکہ اور مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ

جناب محمد حسن الیاس سے ایک انٹرویو

(1)

[”غامدی سینٹر آف اسلامک لرننگ، امریکہ“ کے ڈائریکٹر ریسرچ اینڈ کمیونیکیشن اور ”اشراق امریکہ“ (آڈیو) کے مدیر محمد حسن الیاس صاحب گذشتہ دنوں پاکستان گئے تو ”آف دا اسکول“ پوڈکاسٹ کے میزبان نجم سحر وردی نے اُن کا ایک تفصیلی انٹرویو ریکارڈ کیا۔ اِس انٹرویو میں اُن سے پاکستان اور مسلمانوں کو درپیش مختلف مسائل پر سوالات کیے گئے۔ حسن الیاس صاحب نے اُن کے جواب میں پوری وضاحت سے اپنے موقف کو پیش کیا۔ یہ انٹرویو غامدی سینٹر کے یوٹیوب چینل پر ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔ اِسے ضروری ترتیب و تدوین اور حک و اضافے کے بعد ”اشراق امریکہ“ کے قارئین کے لیے شائع کیا جا رہا ہے۔]

تعارف

نجم سہر وردی: آج ہمارے ساتھ حسن الیاس صاحب موجود ہیں۔ یہ جناب جاوید احمد غامدی کے نمایاں شاگرد ہیں اور ان کے ادارہ ''غامدی سینٹر آف اسلامک لرننگ، امریکہ'' کے ڈائریکٹر ہیں۔ ان کی بڑی خوبی یہ ہے کہ سخت اختلاف کے باوجود ان کے ساتھ تحمل اور شائستگی سے مکالمہ کیا جا سکتا ہے۔ آج کے زمانے میں، جب کہ ہمارا معاشرہ عدم برداشت کا شکار ہے، یہ خوبی ایک بڑی نعمت سے کم نہیں ہے۔ اختلافی موضوعات پر اگر تحمل، تکریم اور سلیقے سے بات ہو تو اس سے سیکھنے کو بھی بہت کچھ ملتا ہے اور معاشرے میں مکالمے کی فضا بھی پروان چڑھتی ہے۔

حسن بھائی، تشریف آوری کے لیے آپ کا شکریہ۔

آج ہم علمی و فکری اور سیاسی و سماجی موضوعات پر بعض اہم سوالات کو زیر بحث لائیں گے۔ مگر اس سے پہلے میری گزارش ہے کہ اپنی ابتدائی زندگی اور اپنے تعلیمی سفر کے بارے میں کچھ تعارف کرا دیجیے۔

محمد حسن الیاس: بہت شکریہ بھائی، حسن ظن کے لیے شکر گزار ہوں۔

میری پیدایش 1988ء کی ہے اور جاے پیدایش کراچی ہے۔ 1988ء سے لے کر 2010ء تک میں پاکستان میں رہا۔ اس میں زیادہ وقت کراچی ہی میں گزرا۔ میری اسکول کی تعلیم بھی یہاں پر ہوئی۔ بارہ تیرہ سال کی عمر تک یہیں پر تعلیم پائی۔ پھر کچھ عرصہ اسلام آباد میں رہا۔ اس کے بعد کراچی واپس آ کر مدرسہ کی تعلیم کا آغاز کیا اور درسِ نظامی کے نصاب کو مکمل کیا۔ پھر 2011ء میں جاوید احمد غامدی صاحب کے پاس ملائیشیا چلا گیا۔ اگلے 8 سال ملائیشیا میں اُنھی کے زیرِ تربیت گزرے۔ اُن سے قرآن و سنت اور حدیث کے علوم کو براہِ راست پڑھنے اور سمجھنے کا موقع ملا۔ 2019ء میں امریکہ منتقل ہو گیا۔ پچھلے پانچ سال سے امریکہ ہی میں مقیم ہوں اور غامدی صاحب کے ساتھ علم و تحقیق اور تصنیف و تالیف کے کاموں میں شب و روز مشغول ہوں۔

پاکستان اور امریکہ کے نظام تعلیم کا فرق

سوال: حسن صاحب آپ نے پاکستان کے اسکول اور مدرسے، دونوں میں تعلیم پائی ہے۔ پھر

آپ نے ملائیشیا اور امریکہ کے نظامِ تعلیم کو بھی دیکھا ہے۔ یعنی آپ کو یہ موقع میسر ہوا ہے کہ پاکستان کے جدید تعلیمی اداروں اور روایتی دینی مدارس کے نظام کو براہ راست جان سکیں۔ پھر امریکہ کے جدید ترین نظامِ تعلیم کو بھی آپ نے دیکھا ہے۔ اِس تناظر میں یہ بتایئے کہ پاکستان اور امریکہ کے نظامِ تعلیم میں کیا فرق ہے؟

جواب: دیکھیں، ہر معاشرے کا نظامِ تعلیم اُس کے حالات کا عکاس ہوتا ہے۔ یہ معاشرے کی کوئی مجرد یا کوئی الگ سے چیز نہیں ہوتی۔ ایک معاشرے کا جو قومی مزاج ہو گا، جو اس کے افکار و نظریات ہوں گے، جو آدرش ہوں گے، جو اہداف ہوں گے، اُنھی سے اُس کا نظامِ تعلیم تشکیل پائے گا۔

اب اگر ہم پاکستان کے نظامِ تعلیم کی بات کریں تو اس کو سمجھنے کے لیے کئی پہلو پیشِ نظر رہنے چاہییں۔ ہم جانتے ہیں کہ گذشتہ کم و بیش دو سو سال سے یہ خطہ ایک تہذیبی بحران کا شکار ہے۔ اِس کی وجہ سے یہاں پر تہذیبی معاملات میں کشمکش اور تصادم نظر آئے گا۔ پھر ہم دیکھتے ہیں کہ یہاں مسلمانوں کی عظمتِ رفتہ کی بازیافت کی بات ہوتی ہے؛ خلافت کے احیا کی تحریکیں اٹھتی ہیں؛ اسے اسلامی ممالک کا قلعہ قرار دیا جاتا ہے۔ پھر انگریزوں کے تسلط سے نجات کی کامیابی کا احساس ہے۔ سول ملٹری تعلقات کی کشمکش ہے۔ اس کے ساتھ یہ خطہ عالمی استعماری طاقتوں کے مفادات کا مرکز بھی ہے اور اس بنا پر اُن کی مداخلت کے اثرات بھی نمایاں ہیں۔

اس مختصر جائزے سے بہ خوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ پاکستان کس قسم کے تہذیبی بحران کا شکار ہے۔ یہی تہذیبی بحران ہمارے رویوں میں ڈھلتا ہے۔ اسی سے ہمارا قومی مزاج تشکیل پاتا ہے۔ پھر یہی مزاج ہمارے نظامِ تعلیم میں منعکس ہوتا ہے۔

ایک اور زاویے سے دیکھیے تو ہمارا تعلیمی نظام درحقیقت اُس دور کی اشرافیہ کا وضع کردہ ہے، جس میں تعلیم کا مقصد چند لوگوں کو اعلیٰ عہدوں تک پہنچانا ہوتا تھا۔ ان اعلیٰ عہدوں تک پہنچانے کے لیے مقابلے کے اصول پر لوگوں کا انتخاب کیا جاتا ہے۔ چنانچہ ہمارا تعلیمی نظام طالب علموں کو جس ہدف کی طرف بڑھاتا ہے، وہ عہدوں تک رسائی اور ملازمت کا حصول ہے۔ دراں حالیکہ حقیقت کے لحاظ سے دیکھا جائے تو تعلیم کا اس پورے تصور سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

تعلیم تہذیبِ نفس کا نام ہے۔ تعلیم انسان کی اس صلاحیت کو نکھارتی ہے، جو اللہ تعالیٰ نے

اسے عطا کی ہوتی ہے۔ میں اکثر یہ بات کہتا ہوں کہ بعض اوقات مشکل معاملات ہمیں زندگی کے وہ اہم سبق سمجھا دیتے ہیں، جو بڑے بڑے فلسفی نہیں سمجھا سکتے۔ میں اپنی بات کو ایک مثال سے واضح کرتا ہوں۔ میرے ہاں، جڑواں بچوں کی پیدائش ہوئی۔ مجھے ان کے حوالے سے یہ فکرمندی تھی کہ کہیں جڑواں ہونے کی وجہ سے یہ کم زور نہ ہوں، چنانچہ میں نے انٹرنیٹ پر مختلف طرح کی تحقیقات پڑھنا شروع کیں، پھر مختلف ڈاکٹروں سے ملا۔ ایک ڈاکٹر صاحب سے جب میں نے پوچھا کہ میرے بچے تین مہینے کے ہوگئے ہیں، دنیا میں تین مہینے کے بچوں کا جو وزن ہوتا ہے، ان کے مقابلے میں میرے بچوں کا وزن کتنا ہے؟ تو انھوں نے مجھے کہا کہ یہ بالکل غلط زاویہ ہے، جس سے آپ سوچ رہے ہیں۔ بچوں کے وزن کا پیمانہ کبھی بھی دنیا کے بچوں کے ساتھ موازنے سے طے نہیں کیا جاتا۔ بچوں کا وزن ان کی پیدائش کے لحاظ سے ہوتا ہے۔ لہٰذا آپ کے بچے کا تقابل اس کی پیدائش سے ہوگا کہ اب وہ کہاں تک پہنچ گیا ہے۔ تعلیم کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے۔ اللہ نے مجھے جو صلاحیتیں دیں، جن کے ساتھ میں پیدا ہوا ہوں، اب ان کو نکھارنے کا نام تعلیم ہے۔ اس تفصیل سے یہ بیان کرنا مقصود ہے کہ پاکستان کا تعلیمی نظام ہمارے قومی بحران کو ظاہر کرتا ہے۔

جہاں تک امریکی معاشرے کا تعلق ہے تو اُس کی اساس جان لاک (John Locke) اور بعض دوسرے اہلِ علم کے سماجی اور سیاسی افکار پر قائم ہے۔ اِس میں انسانیت (Humanism)، آزادیِ اظہارِ رائے (Freedom of expression)، حریت فکر اور حریت آزادی جیسی چیزوں کو بنیادی اقدار (Basic Values) کی حیثیت حاصل ہے۔

امریکہ کا اپنا مذہبی پس منظر ہے، سیاسی جدوجہد کی تاریخ ہے۔ انھوں نے جبر، تسلط اور ظلم جیسی مشکلات کا سامنا کیا ہے۔ اِس سب کچھ کے نتیجے میں وہاں کچھ معاشرتی اقدار پیدا ہوئی ہیں۔ قانون کی حکمرانی ایک قدر ہے، حق خودارادی ایک قدر ہے، آزادیِ رائے ایک قدر ہے، جمہوریت ایک قدر ہے۔ مزید یہ کہ وہاں لوگوں کو نقل مکانی کے معاملے میں مکمل آزادی حاصل ہے۔ اِن عوامل اور ان اقدار نے اُس کے قومی مزاج کو وجود بخشا ہے اور یہی قومی مزاج اُن کے تعلیمی نظام میں کارفرما ہے۔

لہٰذا امریکہ میں تعلیم کا تصور اس سے بالکل مختلف ہے، جو ہمارے ہاں پاکستان میں پایا جاتا ہے۔

وہاں تعلیم یافتہ ہونے کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے کہ آپ اعلیٰ درجے کی ڈگریاں رکھتے ہیں۔ امریکہ کے اگر اعداد و شمار دیکھیں تو بہت کم تعداد ہے جو ہائیر ایجوکیشن اور یونیورسٹی لیول تک جاتی ہے، اور ہونا بھی ایسے ہی چاہیے۔ سوسائٹی کے اندر اختصاصی تعلیم (Specialization) حاصل کرنے والوں کی تعداد دس سے بارہ فی صد ہوتی ہے، لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ باقی غیر تعلیم یافتہ تصور کیے جاتے ہیں۔ باقی لوگ اپنے شعور اور روزگار کو بہتر کرنے کے لیے اپنی دل چسپی کے شعبے میں مہارت حاصل کرتے ہیں، مثلاً وہ زبان (Language) سیکھتے ہیں، یا مختلف طرح کے ہنر (Skills) سیکھتے ہیں۔ آپ اندازہ کریں کہ وہاں انسان کی بنیادی ضروریات کی مہارت (Skills) کو وہ اسی طرح محنت سے سیکھتے ہیں، جیسے کوئی اعلیٰ ڈگری لینے والا شخص اپنی ڈگری کے لیے محنت کرتا ہے۔ اور پھر یہی وجہ ہے کہ وہاں ہنر مند کی وہی عزت ہے جو ایک پی ایچ ڈی اسکالر کی ہوتی ہے، بلکہ شاید اس سے زیادہ عزت ہوتی ہے۔

[باقی]

شاہد محمود

خبر نامہ ”المورد امریکہ“

[جون 2024ء]

ہفتہ وار درس قرآن و حدیث

مئی 2024 میں غامدی سینٹر کے زیر اہتمام جناب جاوید احمد غامدی کے لائیو درسِ قرآن و حدیث کی نشستوں میں غامدی صاحب نے سورۂ بنی اسرائیل کی 83 تا 101 اور سورۂ کہف کی 1 تا 5 آیات کا درس دیا، جب کہ درس حدیث کی نشستوں میں ”عذاب قبر“ کے حوالے سے احادیث پر بات ہوئی۔ قرآن و حدیث کے دروس کی یہ نشستیں غامدی سینٹر کے یوٹیوب چینل پر دیکھی جا سکتی ہیں۔

”غامدی صاحب کی تحریر و تقریر کا دائرہ“

منظور الحسن صاحب کا یہ مضمون جناب حسن الیاس اور غامدی صاحب کے درمیان ایک گفتگو سے ماخوذ ہے۔ اس میں غامدی صاحب کے رفقا کی طرف سے کیے جانے والے اس اعتراض کو زیر بحث لایا گیا ہے کہ غامدی صاحب ایک دین کے عالم ہیں، لہٰذا انھیں صرف دینی موضوعات ہی پر گفتگو کرنی چاہیے۔ دین کے علاوہ دوسرے موضوعات پر بات کرنے سے ان کی شخصیت اور دعوت، دونوں متنازع ہو جاتے ہیں۔ اعتراض کو نقل کرنے کے بعد منظور الحسن صاحب نے اس پر غامدی صاحب کا موقف بیان کیا ہے اور بتایا ہے کہ غامدی صاحب ہمیشہ انھی چیزوں کو موضوع بناتے ہیں، جنھیں دعوت کے کام میں موضوع بنانا ضروری ہے۔ ان کی تصانیف اور گفتگوؤں میں دعوتِ دین

سے متعلق مثبت چیزوں کی شرح و وضاحت کے ساتھ ان تمام موضوعات کو زیر بحث لایا گیا ہے، جو دعوت کے مخاطبین کے فکر و عمل کا حصہ ہیں۔ اس مضمون میں مختلف مثالوں سے واضح کیا گیا ہے کہ غامدی صاحب نے سیاسی، معاشی اور تاریخی موضوعات پر جو لکھا ہے یا جو گفتگو کی ہے، وہ ان کی دینی یا منصبی ذمہ داری سے غیر متعلق نہیں ہے۔ اس مضمون کو ''اشراق امریکہ'' کے مئی 2024 کے شمارے میں پڑھا جا سکتا ہے۔

''جنسی ہراسانی کی شکایت''

حسن الیاس صاحب نے اپنے اس مضمون میں جنسی ہراسانی کا شکار لوگوں کے حوالے سے قانونی اور اخلاقی پہلوؤں کو نمایاں کیا ہے۔ اس ضمن میں انھوں نے معاشرے کی تربیت اور قانون سازی سے متعلق بعض مفید نکات بیان کیے ہیں۔ اُن کے نزدیک جنسی ہراسانی جیسے معاملات کے لیے خاص محکمے بننے چاہییں اور جب تک جرم پوری طرح ثابت نہیں ہو جاتا، ملزم کا نام ظاہر نہیں ہونا چاہیے۔ جرم کے ثبوت کے لیے عینی گواہ تلاش کرنے کے بجاے نفسیاتی تجزیہ کر کے، ماضی کے احوال جان کر اور واقعاتی قرائن کی بنا پر معاملے کی گہرائی تک پہنچنا چاہیے۔ اس طرح کے معاملے میں کوئی شخص مجرم ثابت ہوتا ہے تو پھر شکایت کنندہ یا محکمے کو چاہیے کہ وہ اس موقع پر ہی اس کی شناخت کا اعلان کریں تاکہ باقی لوگوں کو متنبہ کیا جا سکے۔ الزام غلط ثابت ہونے کی صورت میں الزام لگانے والے پر سزا یا جرمانہ عائد ہونا چاہیے۔ الزام ثابت ہونے کے بعد مجرم کو جسمانی سزا کے ساتھ ساتھ اس کے نفسیاتی علاج معالجہ کا بندوبست بھی کیا جانا چاہیے۔ یہ مضمون ''اشراق امریکہ''، مئی 2024ء کے شمارے میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

غامدی صاحب کی ہفتہ وار سوال و جواب کی نشستیں

گذشتہ ماہ غامدی سینٹر کے زیر اہتمام ہونے والی ہفتہ وار سوال و جواب کی نشستوں میں جن اہم موضوعات کو زیر بحث لایا گیا، وہ یہ ہیں: ''مسئلۂ فلسطین اور اس کا حل''، ''قرار داد مقاصد'' اور ''کیا مسلمان دوبارہ عروج پا سکتے ہیں؟''۔ مسلمانوں کے دوبارہ عروج حاصل کرنے کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے غامدی صاحب نے قوموں کے عروج و زوال کے حوالے سے خدائی اسکیم

بیان کرتے ہوئے بتایا کہ کسی قوم کا دنیا پر عروج کے لیے منتخب ہونا سر تا سر خدائی فیصلہ ہوتا ہے، لیکن اس عروج کو برقرار رکھنے کے لیے کسی قوم کا علم و اخلاق میں برتر ہونا ضروری ہے۔ جب کوئی قوم علم و اخلاق میں پستی کا شکار ہوتی ہے تو وہ روبہ زوال ہو جاتی ہے۔ سوال و جواب کی ان نشستوں کی ریکارڈنگ ادارے کے یوٹیوب چینل پر ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔

''البیان'' کی انگریزی زبان میں تدریس

غامدی صاحب کی تفسیرِ قرآن ''البیان'' کی انگریزی زبان میں تدریس کا سلسلہ جاری ہے۔ گذشتہ ماہ ڈاکٹر شہزاد سلیم نے اس کے 3 لیکچرز ریکارڈ کرائے، جن میں سورۂ بقرہ کی آیات 243 تا 286 اور سورۂ آل عمران کی آیات 1 تا 22 زیر بحث آئیں۔ ان نشستوں کی ریکارڈنگ غامدی سینٹر کے یوٹیوب چینل پر موجود ہے۔

''حج کا مقصد کیا ہے؟''

یہ سوال علی فاروق صاحب نے حج کے موضوع پر حسن الیاس صاحب کے ساتھ کیے گئے ایک پروگرام میں اٹھایا ہے۔ اس پروگرام کا مقصد یہ تھا کہ ہر سال دنیا بھر سے لاکھوں لوگ حج کے لیے جاتے ہیں، لیکن ان میں سے اکثر لوگ حج کی حقیقت اور مقصد جانے بغیر محض اس کو ایک رسم سمجھ کر ادا کرتے ہیں، لہٰذا اس عظیم عبادت کی حقیقت اور معنویت کو لوگوں میں اجاگر کیا جانا چاہیے۔ چنانچہ انھوں گذشتہ ماہ حج کے موضوع پر ایک تفصیلی پروگرام ریکارڈ کرایا، جس میں حسن الیاس صاحب نے حج کی تاریخ، پس منظر اور اس کے مقصد کو واضح کیا اور مناسک حج کی تفصیل اور مقصد بیان کرتے ہوئے بتایا کہ حج اصل میں اللہ تعالیٰ کی راہ میں اپنی جان قربان کرنے کے جذبے کی ایک عملی مشق ہے۔ مزید برآں، عبادات کا مقصد بتاتے ہوئے کہا کہ عبادات خدا کے ساتھ انسان کے تعلق کو مضبوط کرتی ہیں اور کائنات کی اسکیم کو سمجھنے میں مدد کرتی ہیں۔ اس پروگرام کی ریکارڈنگ ادارے کے یوٹیوب چینل پر دیکھی جاسکتی ہے۔

غامدی سینٹر کے آن لائن تعلیمی کورسز

گذشتہ ماہ غامدی سینٹر نے اپنے آن لائن لرننگ پلیٹ فام پر دو تعلیمی کورسز شائع کیے ہیں، جن

کے عنوان ہیں: "The Muslim Prayer" اور "Islamic Directives About Core Family & Marriage Related Issues"۔ یہ دونوں کورسز نہایت کم قیمت پر غامدی سینٹر کی ویب سائٹ پر دستیاب ہیں۔ اس کے علاوہ مزید دو کورسز پر کام جاری ہے، جن میں سے ایک کا عنوان "Jihad in Islam" ہے اور دوسرے کا "Dietary Shariah and Islamic Customs"۔ یہ دونوں کورسز بھی جلد ہی غامدی سینٹر کی ویب سائٹ پر دستیاب ہوں گے۔

"حدیث کیا ہے؟"

پچھلے کئی ماہ سے غامدی سینٹر کے زیر اہتمام 23 اعتراضات کی ویڈیو سیریز میں "حدیث کیا ہے؟" کا موضوع زیر بحث ہے۔ گذشتہ ماہ اس موضوع کے تحت لفظ "تبیین" کے مفہوم کے حوالے سے قرآن مجید کی مختلف آیات پر گفتگو ہوئی اور اس سوال کو بھی زیر بحث لایا گیا کہ کیا قرآن مجید میں لفظ "تبیین" انھی معنوں میں استعمال ہوا ہے جن معنوں میں غامدی صاحب اسے استعمال کرتے ہیں۔ مزید برآں، ذخیرۂ حدیث میں قرآن مجید کے نسخ، ترمیم، تخصیص اور تحدید کی جو مثالیں ملتی ہیں، ان کی حقیقت کو بھی واضح کیا گیا ہے۔ ان نشستوں کی ریکارڈنگ غامدی سینٹر کے یوٹیوب چینل پر دیکھی جاسکتی ہے۔

"اللہ کی راہ میں خرچ اور قرآن"

ریحان احمد یوسفی صاحب کا یہ مضمون "اشراق امریکہ" کے گذشتہ ماہ کے شمارے میں شائع ہوا ہے۔ اس مضمون میں انھوں نے قرآن مجید کی روشنی میں انفاق فی سبیل اللہ کی اہمیت و فضیلت بیان کی ہے۔ لکھتے ہیں کہ اللہ کی راہ میں خرچ کرنا دین اسلام کے بنیادی مطالبات میں سے ایک ہے اور مال کی محبت پر آخرت کو ترجیح دینا ہی تمام تر انفاق کی بنیاد ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مال دراصل دنیا کے قائم مقام ہے، جس سے دنیا کی ہر چیز خریدی جاسکتی ہے۔ مال کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کا مطلب ہے کہ انسان اپنی مالی نعمت کو اللہ کے ارادے کے مطابق استعمال کرے۔ اسی طرح قرآن کی رہنمائی سے معلوم ہوتا ہے کہ مال دینے والے کو نہ احسان جتانا چاہیے اور نہ ہی لینے

والوں کی دل آزاری کرنی چاہیے۔ مال کی اس نعمت کو قرآنی احکام کے مطابق خرچ کرنے والے قیامت کے دن اپنی اس تجارت پر بہت خوش ہوں گے۔

''تنقید کرنے اور سننے کے آداب''

یہ غامدی سینٹر کے زیر اہتمام شروع ہونے والی ایک نئی سیریز کا عنوان ہے۔ ان نشستوں میں تنقید کیسے کریں، تنقید کرنے کے اصول وضوابط کیا ہیں اور شخصی تنقید، علمی تنقید، کسی ادارے، مشن یا سیاسی لیڈر پر تنقید کے آداب کیا ہیں، جیسے اہم سوالات کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ ان نشستوں کی ریکارڈنگ ادارے کے یوٹیوب چینل پر موجود ہے۔

والدین، نوعمری اور ازدواجی زندگی کے مسائل

شہزاد سلیم صاحب ہر ماہ لوگوں سے آن لائن نجی مشاورتی سیشن کا اہتمام کرتے ہیں۔ ان سیشنز میں لوگ اپنے مختلف ذاتی اور خاندانی نوعیت کے مسائل میں شہزاد سلیم صاحب سے مشاورت کرتے ہیں۔ گذشتہ ماہ اس سلسلے کے 30 سے زائد سیشنز ہوئے، جن میں لوگوں نے شہزاد سلیم صاحب سے والدین کو درپیش مشکلات اور نوعمری اور ازدواجی مسائل کے حل کے لیے مشاورت کی۔

''دائرۂ حمیدیہ'' اور ماہنامہ ''الاصلاح''

امین احسن اصلاحی کے سوانح نگار نعیم احمد بلوچ صاحب نے ''حیات امین'' کی گذشتہ ماہ شائع ہونے والی قسط میں ''دائرۂ حمیدیہ'' کے قیام اور ماہنامہ ''الاصلاح'' کے اجرا کے بارے میں لکھا ہے۔ لکھتے ہیں کہ امام فراہی کی علمی دریافتوں کو اہل علم تک پہنچانے کے لیے 1935ء میں ''دائرۂ حمیدیہ'' کا قیام عمل میں لایا گیا۔ اس ادارے کے بنیادی مقاصد تین تھے: ایک یہ کہ ایک ماہنامے کا اجرا کیا جائے، جس میں امام فراہی کی تصانیف اور دوسرے علمی مضامین شائع ہوں گے۔ دوسرے یہ کہ امام فراہی کی کتب کا اردو ترجمہ کیا جائے گا اور تیسرے یہ کہ امام فراہی کی کتب کی اشاعت کا باقاعدہ اہتمام کیا جائے گا۔ ان سارے کاموں کی نگرانی مولانا امین احسن اصلاحی کے ذمے لگا دی گئی اور یہ بھی طے ہوا کہ ''الاصلاح'' کے مدیر اور دوسرے مقاصد کے حصول کے

لیے رفقاے کار کا انتخاب بھی مولانا ہی کریں گے۔ یہ مضمون ''اشراق امریکہ'' کے مئی 2024ء کے شمارے میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

''فکری گم راہی کے پانچ اسباب''

اس عنوان سے غامدی سینٹر کے یوٹیوب چینل پر ایک سلسلۂ گفتگو نشر کیا گیا ہے۔ یہ محمد حسن الیاس صاحب سے حمزہ علی عباسی صاحب کے مکالمات پر مشتمل ہے۔ اس سلسلے کی متعدد نشستوں میں متشابہات کی حقیقت، زبان نطق ہے یا منطق، عقلی اور تاریخی مسلمات سے انکار، حدیث اور قرآن کا تعلق اور اجماعِ امت جیسے اہم موضوعات پر بحث کی گئی ہے۔

Ask Dr. Shehzad Saleem

یہ سوال و جواب کی لائیو ماہانہ نشست ہے، جس میں ڈاکٹر شہزاد سلیم لوگوں کے ذہنوں میں اٹھنے والے مختلف دینی، اخلاقی اور معاشرتی موضوعات سے متعلق سوالوں کے جواب دیتے ہیں۔ اس نشست میں لوگ اردو اور انگریزی، دونوں زبانوں میں اپنے سوال پوچھ سکتے ہیں۔ اس کی ریکارڈنگ ادارے کے یوٹیوب چینل پر دیکھی جا سکتی ہے۔

''علم و حکمت: غامدی کے ساتھ''

مئی 2024ء میں دنیا نیوز چینل پر نشر ہونے والے پروگرام ''علم و حکمت: غامدی کے ساتھ'' میں جن موضوعات پر گفتگو کی گئی، وہ یہ ہیں: ''نبوت کی حقیقت''، ''اللہ پر ایمان کی روشنی''، قرآن مجید کے اردو تراجم کی روایت'' اور ''نکاح و طلاق: شرعی احکام اور ملکی قوانین''۔ ان پروگراموں کی ریکارڈنگ ادارے کے یوٹیوب چینل پر موجود ہے۔

''اسلام اسٹڈی سرکل''

گذشتہ ماہ ''اسلام اسٹڈی سرکل'' پروگرام میں قرآن مجید، حدیث اور بائیبل کے جو موضوعات زیر بحث رہے، ان کے عنوانات بالترتیب یہ ہیں: ''پختہ ایمان''، ''شادمان چہرہ'' اور ''دو آقا: خدا اور لالچ''۔ مزید برآں، سیشن کے آخر میں ''میں اپنے غصے کو کیسے کنٹرول کر سکتا ہوں؟'' پر بھی

گفتگو کی گئی اور سوالوں کے جواب دیے گئے۔ اس کی ریکارڈنگ غامدی سینٹر کے یوٹیوب چینل پر ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔

خواتین کے لیے یوٹیوب چینل کا آغاز

غامدی سینٹر کے زیر اہتمام خواتین کے لیے ایک الگ یوٹیوب چینل کا آغاز کیا گیا ہے، جس پر خواتین کے دینی حقوق، تعلیم و تربیت، سماجی کردار اور ان کو درپیش مسائل و چیلنجز کے حوالے سے مختلف پروگرامز پیش کیے جارہے ہیں۔

''سنڈے اسکول'' میں اندراج

غامدی سینٹر کے زیر اہتمام چلنے والے ''سنڈے اسکول'' کا مقصد طلبہ میں قرآن و سنت کی روشنی میں بنیادی اسلامی اقدار کو پروان چڑھانا ہے۔ یہ اسکول ڈاکٹر شہزاد سلیم صاحب کی نگرانی میں سرگرم عمل ہے۔ اس اسکول کے فیکلٹی ممبران کالج اور یونیورسٹی کے وہ طلبہ ہیں جو غامدی سینٹر اور ''المورد'' کی دعوت سے متاثر ہیں اور اس کے کاموں میں اپنا حصہ ڈالنا چاہتے ہیں۔ سنڈے اسکول میں نئے طلبہ کے اندراج کا آغاز جون 2024 میں ہو گا۔

''میزان'' کی انگریزی زبان میں تدریس

گذشتہ ماہ شہزاد سلیم صاحب نے ''میزان'' کے جن موضوعات پر انگریزی زبان میں لیکچر ریکارڈ کرائے، وہ یہ ہیں: ''حجاب کے مسائل''، ''مسائل زکوٰۃ''، ''حرابہ کی سزا''، ''قتل کی سزا'' اور ''زنا کی سزا''۔ ان لیکچرز کو غامدی سینٹر کے یوٹیوب چینل پر دیکھا جاسکتا ہے۔

''مسئلۂ فلسطین: دینی اور تاریخی پس منظر'' کی انگریزی ڈبنگ

کچھ عرصہ قبل جناب حسن الیاس نے غامدی صاحب کے ساتھ مسئلۂ فلسطین پر اردو زبان میں ایک سیریز ریکارڈ کی تھی، جس کو غامدی سینٹر کے اردو یوٹیوب چینل پر نشر کیا گیا تھا۔ ان نشستوں میں اسرائیل و فلسطین تنازعے کا دینی اور تاریخی پس منظر بیان کرنے کے ساتھ ساتھ اس مسئلے کا حل بھی پیش کیا گیا تھا۔ غامدی سینٹر نے AI کے ذریعے سے ان نشستوں کی انگریزی میں ڈبنگ کر

کے اپنے انگریزی یوٹیوب چینل پر نشر کیا ہے تاکہ انگریزی جاننے والے لوگ اس سے استفادہ کر سکیں۔

دینی آرا پر مبنی فتاویٰ کا اجرا

مئی 2024ء میں جناب حسن الیاس نے نکاح و طلاق، وراثت (inheritance) اور بعض دیگر معاشی اور معاشرتی پہلوؤں پر غامدی صاحب کی رہنمائی میں 4 فتوے جاری کیے۔

جہاد کورس کی ریکارڈنگ

مئی 2024ء میں شہزاد سلیم صاحب نے جہاد کے موضوع پر ایک تفصیلی لیکچر ریکارڈ کرایا۔ یہ بنیادی طور پر جہاد کے موضوع پر مرتب کردہ نصاب ہے، جس میں انھوں نے جہاد کی اجازت، نوعیت، مقصد اور اس کے اخلاقی حدود کے بارے میں گفتگو کی ہے۔ مزید برآں انھوں نے بتایا کہ جہاد میں اللہ تعالیٰ کی مدد کا ضابطہ کیا ہے، جنگی قیدیوں کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے گا اور مال غنیمت کی تقسیم کیسے ہو گی۔ یہ لیکچر انگریزی زبان میں ہے اور اس کو غامدی سینٹر کے یوٹیوب چینل پر دیکھا جا سکتا ہے۔